

خطباتِ نظامی



علامہ مشتاق احمد نظامی

روحانی پبلیشرز
نورانی جامع مسجد، مین بازار دھام نگر، چو بڑھی، لاہور

دعای پیر زین العابدین
علیه السلام

خطبات نظامی

خطیب مشرق

علامہ مشتاق احمد نظامی

بانی آل انڈیائی تبلیغی جماعت و ادارہ شریعہ مہاراشٹر
و دارالعلوم غریب نواز الہ آباد

فاشی
روحانی سلسلہ نورانی مسجد مین بازار
شام نگر چو بجی لاہور

خطبات نظامی	-----	نام کتاب
علامہ مشتاق احمد نظامی	-----	نام مولف
ربیع الآخر ۱۴۱۲ھ	-----	تاریخ طباعت
علامہ غلام رسول رضوی	-----	معاون خصوصی
محمد عبدالعزیز مخدوم	-----	ناشر
روپے	-----	ہدیہ

واحد تقسیم کار

مکتبہ نوریہ رضویہ

۱۱- گنج بخش روڈ لاہور فون ۲۱۳۱۹۱

مکتبہ خفیعہ
جامعہ خفیعہ غوثیہ شیرکوٹہ بند روڈ لاہور

فہرست

عرضِ ناشر

پیش گفتار

اشعار قبل از تقریر

اشعار بعد از تقریر

آرزو دل

دلائل چار ہیں

صحیح عقائد مدارِ نجات ہیں

اسلام میں یادوں کی اہمیت

سراج منیر

ایک سوال کا جواب

اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

وقت کے ابھرے ہوئے سوال کا جواب

حسین اعظم رضی اللہ عنہ

منصب ولایت

سلام و قیام

تصویر کا دوسرا رخ

۱

۲۲

۲۶

۲۸

۵۶

۸۵

۱۱۵

۱۲۹

۱۴۳

۱۵۷

۱۷۱

۱۸۱

۲۰۶

۲۱۲

عرض ناشر

الحمد للہ روحانی پبلشرز ترقی کی راہ پر گلزن ہے اور ادارہ ہذا کی یہ کوشش ہے اور رہے گی کہ قارئین کو علمی، ادبی اور روحانی کتب سے روشناس کرایا جائے۔ قبل ازیں ادارہ نے عملیات کی عظیم کتاب شمع شبستان و ضحا کی تصحیح کر کے قارئین کی خدمت میں پیش کی۔ اب دنیائے ادب کے مایہ ناز شاہ سوار علامہ مشتاق احمد نظامی کی علمی اور ادبی روحانی کتاب ”خطبات نظامی“ قارئین اکرام کی خدمت میں پیش کر رہا ہے جو کہ علماء، ادباء، سکالرز، صحافی، طلبہ کیلئے یکساں مفید ہے۔

آخر میں میں اپنے کرم فرما بزرگ حضرت علامہ محمد غلام رسول رضوی کا ممنون و مشکور ہوں کہ انہوں نے کتاب ہذا کی اشاعت و طباعت میں خصوصی تعاون فرمایا۔

پیش گفتار

خطابت بحیثیت فن کوئی آج کی ایجاد نہیں ہے۔ پہلے بھی سرفن نے جادو جگائے ہیں، فسوں کاریاں کی ہیں۔ پہلے بھی اس فن کی مدرسے بڑے بڑے میدان سرکے گئے ہیں سست ہوا اور دون ہمت لوگوں نے جب بھی جد عمل سے پہلو تہی کی ہے اور اپنی بے پرواہی، اپنے ضعف اور اپنی بیچارگی کو بہت نہ بنایا ہے تو زور خطابت ہی نے ان کا ہلو گر مایا ہے، ان میں جوش و ولولہ پیدا کیا ہے۔ اور ان کی رگوں میں بجلیاں بھر دی ہیں۔ پھر یہی ضعف و ناتوانی کا غدر لٹاک پیش کرنے والے آندھیوں سے بھی لڑ گئے ہیں، بجلیوں سے بھی آنکھیں لڑائی ہیں، اور طوفانوں سے بھی مقابلہ کیا ہے۔ آج بھی اپنی جماعت میں ایسے ایسے جادو بیان اور سیف زبان خطیب موجود ہیں۔ کہ اگر وہ چاہیں تو اپنی جادو بیانی سے پتھر کے جگر میں بھی شگاف کر دیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ ان یکے تازان عرصہ خطابت میں علامہ نظامی صاحب ایک انفرادیت رکھتے ہیں۔ ان کی اپنی ایک الگ حیثیت ہے۔ وہ اپنی کھنگی اور پیرانہ سالی کے باوجود آج بھی شہرستان خطابت کے شہریار ہیں۔ کشور خطابت میں آج بھی ان ہی کا سکھ چلتا ہے۔ چنانچہ جس نے بھی علامہ نظامی کو سنا یا پڑھا ہے وہ ہماری اس رائے سے اتفاق کریں گے کہ اپنی جماعت میں علامہ نظامی ہی وہ

پہلے شخص میں جنھوں نے خطابت کو نئی سمت عطا کی، نئی وسعتوں اور نئی پہنائیوں سے روشناس کیا۔ وقت کے ژولیدہ مساکل کا جتنا خوبصورت حل علامہ موصوف پیش کرتے ہیں۔ اس کی مثال ہمیں ادنیٰ ملتی۔ بڑے سے بڑے فلسفیانہ مباحث کو محی کافنی رنگ اور تمثیلی انداز میں پیش کرنے کا تسلیقہ کوئی نظامی صاحب سے سیکھے۔

حک کہاں سے لائے گا قاصد بیاں میرا زباں میری
یہ بات انتہائی سترت کی ہے کہ اب ہماری جماعت میں
شیریں مقال خطیبوں اور شعلہ نوا مقررین کی کمی نہیں ہے۔ اس
کے علاوہ دینی واقفیت کے لئے خطبات یا تقریروں کے مختلف
سیریز یا سیریس بھی نہایت ارزاں قیمت پر ہر جگہ دستیاب ہیں
لیکن مجھے کہنے دیجئے :

خدا معلوم کس نے کہہ دیا ہے کم سوادوں سے
کہ جو تیشہ اٹھا لیتا ہے وہ فراد ہو تا ہے
علامہ نظامی کی زمانہ کو آج بھی ضرورت ہے۔ کیوں کہ ان
کی تقریروں میں معنویت و مقصدیت کے علاوہ جو سلاست و روانی
سادگی و پرکاری، برجستگی اور بے ساختگی ہے وہ اور جگہ کہاں؟
ڈھلے ڈھلائے الفاظ، ترشے ترشے لفظائے جلے، کوثر کی دھلی زبان
کہاں بائیں گے دوسرے مقررین؟

یہ صحیح ہے کہ نظامی صاحب کو ایکٹنگ یا اداکاری نہیں آتی
انھیں بننے سنورنے یا میک اپ کرنے کا ڈھنگ بھی نہیں معلوم
لیکن یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ جذبات کی جو کار فرمایاں علامہ نظامی
صاحب کے یہاں ہیں وہ اور کہیں نظر نہیں آتیں۔ خلوص کی جوشدت

آپ یہاں پائیں گے اس کا ہر جگہ فقدان ہے۔ ان کے علاوہ عقیدہ و ایمان کی اصلاح و درستگی اور سنیت کی تبلیغ و اشاعت کے لئے علامہ نظامی جس طرح اپنا خون جگر پانی کر رہے ہیں اس کی داد نہ دینا انصاف کا خون کرنا ہے۔

مجھے اس بات کی بے حد خوشی ہے کہ میں ”خطبات نظامی“ کے لئے پیش گفتا سرا لکھنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ حضرت علامہ سے متعلق پہلے جو میرا خیال تھا آج بھی وہی ہے۔ پہلے کبھی میں نے ان کا تعارف کراتے ہوئے لکھا تھا کہ:

”نظامی صاحب کو اعلیٰ حضرت سے قلبی تعلق اور جذباتی وابستگی کی بنا پر ہی وہ ان کے مشن کو فروغ دینا اپنی سب سے بڑی سعادت سمجھتے ہیں؛ علاوہ ازیں نظامی صاحب میں دینی خدمت کا جذبہ بھی انشا شدہ ہے کہ وہ تمام اقدارِ حیات کو مسلمان بنادینا چاہتے ہیں۔ لیکن اسلام ان کے نزدیک وہی معتبر ہے جو بریلوی نقطہ نگاہ رکھتا ہے اور جو صرف بریلوی مکتبہ فکر کی آغوش میں پلتا ہے۔ چنانچہ اعمال و افعال کے لئے بھی وہی پیمانے ان کے نزدیک معتبر ہیں، جن پر بریلویت کی چھاپ ہو۔ فکر و نگاہ کے لئے بھی وہی زاویے قابل و ثوق ہیں جن پر بریلی کی عینک چڑھی ہو۔“

غرض ان کے نزدیک وہی سکہ رائج الوقت ہے جو بریلی اور صرف بریلی کی نکسال میں ڈھلتا ہے۔“

خطباتِ نظامی کے سلسلے میں بھی جو پیشیں گوئی پہلے
کر چکا ہوں آج بھی وہی دہرا رہا ہوں۔

خطباتِ نظامی میں شعلہ نوا بیاں بھی قید ہوئی ہیں شریں
بیانیاں بھی۔ اس میں طنطنہ خیال بھی منضبط ہوا ہے زمزمہ بیان بھی
بہمہ خیال بھی ریکارڈ ہوا ہے لخت افکار بھی۔ غرض اس میں وہ تمام
علمی موشگافیاں اور نکتہ آفرینیاں جو کبھی اسٹیج پر خطابت کی گھن
گرج میں نظامی صاحب سے سنی گئی تھیں یا جواب تک نظامی صاحب
کے حاشیہ خیال میں محفوظ تھیں، ان سبھوں کو مختلف عنوانات کے
تحت جمع کر دیا گیا :

طر کرنا ہوں جمع پھر جگر تخت تخت کو

خطباتِ نظامی سے متعلق جوابات نیچے جارہا ہوں وہ
یہ ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ سے یہ حقیقت مجھ پر منکشف ہوئی
کہ حضرت قبلہ گاہی زبان و بیان پر بھی بے انتہا قدرت
رکھتے ہیں۔ وہ جب کسی واقعے کو پھیلانا چاہتے ہیں تو اس کی درازی
معتوق کی زلف دراز سے بھی بڑھا دیتے ہیں، طولِ شبِ فراق سے
بھی، حد یہ کہ فردائے قیامت سے بھی، لیکن جب کسی طولِ طویل واقعے
کو مختصر کرنے پر آتے ہیں تو ہزاروں سال کے فاصلے کو سمیٹ کر
ایک لمحے میں قید کر لیتے ہیں۔ قیامت جس کی درازی کو قرآن نے
پچاس ہزار سال کی مسافت قرار دی ہے کان مقداد و خمین
الف سنۃ لیکن یہی درازی خاصانِ خدا کے لئے سمٹ کر ایک
لمحہ بن جاتی ہے۔ و ما امرنا الساعة الا کلمح المصی

نظامی صاحب کی تقریر کا اعجاز کمال یہ ہے کہ وہ بھی طویل
فاصلے کو مختصر کر کے لمحہ اور لمحہ کو پھیلا کر طویل بنا دیتے ہیں معراج

کے واقعے میں نظامی صاحب نے اسی تکنک سے کام لیا ہے۔ وہ معراج کا سفر مسجد حرام سے شروع کرتے ہیں مسجد اقصیٰ تک جانے کے بعد انھوں نے آسمان کی بلندیوں کی طرف پرواز دکھائی ہے۔ معراج کے دولہا فضاؤں سے گزرتے ہیں، خلاؤں سے گزرتے ہیں، پہنائے آسمان سے بھی گزر جاتے ہیں، پھر سدرۃ المنہی کی بیکراں وسعتوں سے بھی گزر کر عرش اعظم یعنی لامکاں کی بلندیوں پر پہنچتے ہیں۔ اتنی دور دراز مسافت کو نظامی صاحب تقریر کرتے ہوئے صرف ایک گھنٹے میں طے کرتے اور معراج کے دولہا سے متعلق تمام تفصیلات صرف ایک مصرع پر تمام کر ڈالتے ہیں:

عزیمتا مکر رسیدی نہ رسیدی
یہ تو ہوئی سمندر کو قطرے میں سمونے کی مثال، لیکن اگر آپ قطرے کو سمندر بننے دیکھنا چاہتے ہیں تو پھر آقائے کائنات کی بشریت کے موضوع پر نظامی صاحب کی تقریر پڑھیں۔ آقائے کائنات کی بشریت تخلیق کے نقطہ آغاز سے نقطہ اختتام تک ہر جگہ کارفرمانہ نظر آئے گی۔ حیات کو آپ اس کے گونا گوں مظاہر اور رنگارنگ جلووں کے ساتھ اس ایک جود میں انجمن آرا پائیں گے۔ قبلہ نظامی صاحب کی تقریر آپ کو باور کرا دیگی کہ پوری کائنات حسن اپنی تمام جلوہ ساما بیواں اور اپنی ساری دلنشین اداؤں کے ساتھ اس ایک کالبد انسانی میں اتر آئی ہے۔ آقائے کائنات محیفہ ہستی کے حروف آغاز بھی ہیں، اور عنوان زیست کی سطر آخری بھی۔

دہا ہے ہی راز خلقت ہستی بھی ہیں آپ ہی بہار صبح وجود بھی۔ بلکہ یہ ہے کہ تخلیق کی غزل کے مطلع اولیں ہیں آپ نظامی

صاحب نے اسی ایک مطلع کی توضیح و تشریح میں ازل سے ابد تک کی دوری طے کی ہے۔

خطباتِ خطابی اپنی پوری ضخامت اور حجم کے ساتھ دراصل اسی ایک مطلع کی تشریح اور اسی ایک اجمال کی تفصیل ہے۔ نظامی صاحب کی تقریر جیسے جیسے آپ پڑھیں گے آپ کا شوق فزونی ہوتا جائے گا۔ منزل پر پہنچ کر بھی آپ قیام کرنا پسند نہیں کریں گے آپ کا ذوق تجسس ایک منزل سے دوسری منزل اور دوسری سے تیسری منزل تک پہنچنے کے لئے آپ کو رواں دواں رکھے گا۔ غرض آپ کو کسی مقام پر قرار نہیں آئے گا۔

خطابی صاحب بھی کسی مقام پر قرار نہیں پکڑتے۔ چلتا چلتے رہنا، مدام چلنا ان کی زندگی بن چکی ہے۔ چنانچہ عمر کی اس منزل پر پہنچ کر بھی وہ سفر کرتے رہتے ہیں:

طرزِ رہی روانی عمریکہ در سفر گذرد

خطباتِ خطابی کی دوسری اہم خصوصیت اس کی منظر نگاری ہے۔ نظامی صاحب کو منظر نگاری اور مرقع کشی خوش آتی ہے۔ وہ مصوری بھی کر لیتے ہیں اور سپیکر تراشی میں بھی انھوں نے بھارت بہم ہو پجائی ہے۔ چنانچہ اس کتاب میں انھوں نے جمالیاتی کیفیات اور ماورائی حقائق کی منظر کشی اتنی خوبصورتی سے کی ہے کہ طبیعت وجد کرنے لگتی ہے۔

نظامی صاحب اپنی تقریروں میں تشبیہات سے بھی

کام لیتے ہیں، بلکہ تشبیہیں ان کی تقریروں کی جان ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اشاروں کنایوں میں بھی بات کرنے کے عادی ہیں۔ اور تمثیل اور استعارے کی زبان میں تو ان کے ہاں تشبیہ

کا انداز سب سے اچھوتا ہے، سب سے نرالا ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ اس کتاب میں جہاں جہاں کوئی دقیق بات آگئی ہے وہاں وہاں انھوں نے تشبیہات کا ایسا چمن سجایا ہے اور تشبیہات کی ایسی گلکاری بلکہ بہار آرائی کی ہے کہ صفحہ کا صفحہ گلگدہ ارم بن گیا ہے۔ آپ تقریر پڑھتے جائیں گے، آپ پر ایک کیفیت طاری ہوتی جلسے کی۔ آپ عالم سستی میں جھومنے لگیں گے۔ نظامی صاحب کی یہی وہ فنکاری ہے جو انھیں عام مقررین سے ممتاز کرتی ہے۔

فطامی صاحب نے ”روح اور روحانیت“ کے موضوع پر جو تقریریں فلم بند کی ہے وہ ان کی شاہکار تقریر، غیر فانی یادگار اور لازوال کارنامہ ہے۔

اس تقریر کا پس منظر یہ ہے کہ روح جب تک جسم سے متعلق رہتی ہے، ایک خوشبو ہے جسے غنچے کی قید میں ہے، ایک صدا ہے جو پابند ساز ہے لیکن جیسے ہی نفس عنصری سے رہائی پا جاتی ہے اس کی نگاہوں سے سارے عجایب الٰہی جاتے ہیں۔ اور وہ قید زمان و مکان سے آزاد ہو جاتی ہے۔ لیکن روحانیت ہر زمانہ میں رواں دواں ہے، تمام ممکنات پر اسے پہلے ہی سے دسترس ہے۔ اس کی پرواز سرحدِ ادراک سے بھی پر ہے۔ اس کی جولانگاہ حدِ تعینات سے بھی آگے۔ چنانچہ ماضی و مستقبل بھی اس کے نزدیک کچھ نہیں ہے جو کہ ہے حال ہی حال ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ میں نے کسی کتاب میں کبھی پڑھا تھا کہ حضرت علی سہل اصفہانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے کسی نے پوچھا ”عبدالست آپ کو یاد ہے“ انھوں نے جواب دیا ”کیوں نہیں، کل ہی کی تو بات ہے“

اس گفتگو کا علم جب وقت کے امام عظیم المرتبت شیخ حضرت
عبد اللہ انصاری قدس سرہ کو ہوا تو انھوں نے فرمایا حضرت علی ابی
ہریرہؓ ہیں۔ ان کے ذہن میں ابھی بالیدگی نہیں آئی ہے۔ صوفیوں کے
نزدیک کل اور پرسوں کیا صوفیوں کے یہاں جو کچھ ہے آج ہے۔
روز السرت ابھی ختم نہیں ہوا۔ ابھی اس دن کی شب بھی نہیں آئی۔
صوفیوں کے لئے ابھی وہی گھڑی ہے :

پھر صاحب کتاب نے اس موقع پر جو دلیل دی ہے ایمان
کی بات تو یہ ہے کہ اسے رد کیا ہی نہیں جاسکتا۔ وہ لکھتے ہیں :
”آقائے کائنات نے معراج کے سفر میں حضرت یونس علیہ السلام
کو دیکھا تھا کہ وہ پھلی کے پیٹ میں ہیں۔ پھر ان کی ملاقات جنت میں
حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہوئی تھی حضور
نے ان سے پوچھا اے عبدالرحمن ! تم نے یہاں آنے میں اتنی دیر
کیوں کر دی ؟ حضرت عبدالرحمن نے جواب دیا یا رسول اللہ ! میں
کوشش کے باوجود آپ تک نہیں پہنچ سکا۔ آپ کی جدائی میں ہیں
اتنی تکلیف پہنچی کہ ویسی تکلیف اگر بچوں کو ہو تو اس کے صدمے
سے وہ بھی بوڑھے ہوجاتے ہیں۔“

حنو بہن فرمائیے حضرت یونس علیہ السلام کے شکم مای میں رہنے
کا زمانہ رسول پاکؐ کے سفر معراج سے کئی ہزار برس پیش تر کا ہے
اور حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ سے جنت میں ملاقات وقوع قیامت
کے بعد ہوگی۔ قیامت ابھی آئی نہیں۔ قیامت کے آنے میں ابھی
دیر ہے۔ قیامت کا دن بھی پچاس ہزار سال کے برابر ہو گا۔ اس
کے بعد حضرت عبدالرحمن جنت میں تشریف لے جائیں گے۔ لیکن رسول
پاکؐ آج ہی حضرت یونس کو بھی دیکھ رہے ہیں۔ حضرت عبدالرحمن کو بھی

قبول عام حاصل ہو گا۔

نظامی صاحب اگر مجھے معاف کر دیں تو اس موقع پر ایک راز
درون خانہ کا بھی انکشاف کر دوں۔

یہ بات تو آپ بھی جانتے ہیں کہ ان دنوں دینی درسگاہوں سے
تحصیل علم کا شوق رخصت ہو گیا ہے اور طلباء و مدرسین دونوں
ہی میں تقریر کی مشق بہم پہنچانے کا رواج دن بدن بڑھتا جا رہا ہے
اس کی وجہ سیری سمجھ میں جو آتی ہے یہ ہے کہ مدارس کے معلمین کو اپنا
سارا وقت تدریسی خدمات کے لئے وقف کرنا پڑتا ہے اور اس
کا جو معاوضہ انہیں ملتا ہے وہ عام طور سے پانچ یا چھ سو روپے
ہوتے ہیں۔ لیکن اتنی ہی رقم ایک مقرر صرف ایک ٹھنڈے تقریر کر کے
بطور نذرانہ وصول کر لیتا ہے۔ مرغ اور بلاؤ ادھر سے۔

وقت کی اس ستم ظریفی کو دیکھتے ہوئے ہر طالب علم میزان
منسوب بٹھانے کے زمانہ ہی سے تقریر کی مشق کرنے لگتا ہے اور
اس ویڈیو کیسٹ اور ٹیپ ریکارڈر کے زمانے میں کسی کی تقریر
حاصل کر لینا کوئی مشکل کام نہیں رہ گیا۔ چنانچہ دیکھا یہ گیا ہے کہ
جب بھی دینی اجلاس یا کوئی کانفرنس وغیرہ انعقاد پذیر ہوتی ہے
تو ایسے موقعے پر چھوٹے چھوٹے بچے اچھے اچھے مقررین کی تقریر
رٹ کر اسٹیج پر آ جاتے ہیں اور اپنی گل افشانی گفتار سے مجمع کو نثر
کرتے اور ان سے بھرپور داد وصول کر لیا کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ
ہوتا ہے کہ بعد میں جو مقرر اسٹیج پر آتے ہیں ان کا رنگ بھیکا ہوا
جاتا ہے۔ وہ خود بھی احساس کتری کا شکار ہو جاتے ہیں اور مجمع بھی ان
کی وہ پذیرائی نہیں کر پاتا جس کے وہ مستحق ہوتے ہیں۔

مجھے یاد آتا ہے کہ بستی یا بہرائچ کے کسی پروگرام میں میں حضر

علامہ نظامی صاحب کے ساتھ تھا جب تک وہ تقریر فرماتے رہے
میں اسٹیج پر بیٹھا رہا۔ جب ان کی تقریر ختم ہوئی تو میں چائے پینے
کے خیال سے سامنے کی چائے کی دکان پر چلا گیا۔ میں چائے پیتا رہا
اور لوگ نظامی صاحب کی تقریر پر تبصرہ کرتے رہے۔

”معلوم ہوا تھا کہ نظامی صاحب بڑے ناز خیز کے بعد
یہاں آ رہے ہیں۔ ان کے بارے میں یہ بات شہر کی محلی تھی کہ مملکت
خطابت کا تاجدار آ رہا ہے، عرصہ خطابت کا شہسوار آ رہا ہے وہ
آ رہا ہے جس کی گرمی گھنارے سے پتھر کا جگر بھی پگھلتا ہے، جس کی
جادو بیگانی پانی میں بھی آگ لگا دیتی ہے۔ لیکن وہ آیا تو کیا آیا
کوئی نئی بات تو اس نے کی نہیں۔ جو تقریر اس نے کی ہے بالکل وہی
تقریر اسی لب و لہجہ کے ساتھ تو برسوں برسوں یہاں ایک طالب علم
کر گیا ہے۔ بلکہ اس کی تقریر میں جو کشش بھی تھی حسن اور لطافت
بھی۔ ان کی تقریر تو بالکل سپاٹ معلوم ہوتی ہے“

کسی فرصت کے اوقات میں جب میں نے اس واقعے کا
ذکر حضرت علامہ سے کیا تو انہوں نے نہایت سنجیدگی سے فرمایا
اس قسم کا حادثہ تو اکثر پیش آتا ہے کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے
کہ لوگ میری ہی تقریر پر اسی اسٹیج پر نہایت دھڑکتے سے کھڑے
ہیں جس پر خود میں ہوتا ہوں۔

میں نے ان سے پوچھا ”جب ایسی صورت پیش آتی ہے تو
آپ کے دل پر کیا گزرتی ہے؟“

فرمایا ”میں یہ خیال کر کے اپنا جی خوش کر لیتا ہوں۔ غارت
لسانی کی بنیاد پر جو لوگ بھی اپنی عظمت کا تاج محل تعمیر کر رہے
ہیں انہوں نے سنگ و خشت بھی میرے ہی یہاں سے لی ہے اور

سرخی چونا بھی میرے ہی مال گو دام سے حاصل کیا ہے۔“
بیدل آں شعلہ کند و بزم چراغاں گرم است
یک حقیقت بہ ہزار آئینہ تاباں شدہ است

اس تمہید کے بعد مجھے کہنے دیجئے کہ ”خطبات نظامی“ کی
اشاعت چاہے جس جذبے کے تحت عمل میں آئی ہو، ہم کم مانگنا
علم کو نظامی صاحب کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ انہوں نے اپنی
تقریروں کا مجموعہ شائع کر کے ہمارے لئے خطیب الاسلام،
مفکر ملت اور خطیب الہند وغیرہ بننے کی راہ ہموار کر دی ہے۔
اس کتاب کے مطالعے سے جہاں یہ حقیقت واضح ہو
جاتی ہے کہ نظامی صاحب ایک ژرف نگاہ مفکر ایک بالیدہ
ذہن خطیب ہیں وہیں یہ حقیقت بھی آشکارا ہوتی ہے کہ نظامی صاحب
ملت کے جوانوں کے لئے اپنے دل میں کتنا بے پناہ درد رکھتے
ہیں۔ اللہ تعالیٰ نظامی صاحب کا سایہ عاطفت ہم نیاز مندوں
پر دراز تر فرمائے۔ آمین

عز قلم این جارسید و سرشکست

ضیاء جکالوی

۳۰/۸/۶۰



خطبے کے بعد آغاز تقریر سے پہلے

— جن میں بھول کا کھٹنا کوئی بات نہیں
 رہے وہ بھول جو گلشن بنا دے صحر کو
 — یہ ارض مقدس ہے یہ طیبہ کی زمیں ہے
 جنت بھی یہیں، مالک جنت بھی یہیں ہے

— طوفان نوح لانے سے اے چشم فائدہ
 ددا شک بھی بہت ہے اگر کچھ اثر کریں
 — تمہیں کالی گھٹا کا بھی نہیں پہنا آتا !!
 نشیمن سے دھواں اٹھتا ہے تم غمتے ہو سادون ہے

— جو شے تیری نگاہ سے گزرے درود پڑھ
 ہر جزو کل ہے منظم ^{مصطفیٰ} الزا ^{میں}
 — اب تو پھولے نہ سائیں گے گفن میں آرسی،
 ہے شب گوز اس گل سے ملاقات کی رات

— جب تک بکا نہ تھا کوئی بوچھتا نہ تھا
 تم نے خود کر مجھے انوں کو دیا

اے رضا ہر کام کا اکٹ وقت ہے
 دل کو بھی آرام ہو ہی جائے گا
 اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
 نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے
 منظور ہے اس بزم میں اصلاح مفارہ
 نشتر جو لگاتا ہے وہ دشمن نہیں ہوتا
 نہ ادھر ادھر کی تو بات کہ یہ بتا کہ قابض کیوں نہ
 مجھے رہزنیوں سے غرض نہیں تیری رہبری کا سوال ہے
 یہاں کوتاہی ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
 جہاں بازو میٹھتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے
 یوں سکرائے جان سی کلیوں میں بڑ گئی !!
 یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا !!
 عجب کچھ پھر میں ہے کیے والا حجب و دامال کا
 جو یہ ادھر تو وہ ٹانکا جو یہ ٹانکا تو وہ ادھر
 نہ خنجر اٹھے گا نہ تلوار ان سے
 یہ بازو میرے آزمائے ہوئے ہیں
 وہ سجدہ تو سجدہ ہوا ہی نہیں
 کہ سر جھک گیا دل جھکا ہی نہیں
 واسے ناکائی زاہد کی جبین پر
 داغ بکدہ تو بنا داغ محبت نہ بنا
 پہرے لگے ہوئے ہیں میرے عرض حال پر
 میں لب کشا ہوں یہ ہے بڑی بات ان دنوں

نشین پر نشین اس قدر تعمیر کرتا جا
 کہ بھلی گرتے گرتے آپ خود بیزار ہو جائے
 پھول لے کر پھول آیا، پھول کر میں نے کہا
 پھول لے کر کیا کریں گے تم تو خود ہی پھول ہو
 تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا
 میں جان گیا بس تیری پہچان یہی ہے،
 نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
 مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو قحطام لے ساقی
 نہ تیغ دتیر بہ تکیہ، نہ خنجر بہ نہ بھالے پر
 بھروسہ تھا تو ایک سادہ سی کلمی والے پر
 دل کو قحطام، ان کا دامن قحطام کے
 ہاتھ اپنے دونوں نکلے کام کے
 ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
 وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا
 صاف چھپتے بھی نہیں سانس آتے بھی نہیں
 خوب پردہ ہے کہ چلن سے لگے بیٹھے ہیں
 ایسے کسی سائے میں سو جانے سے کیا چل
 جب بند ذرا ٹوٹے ہر خواب بکھر جائے
 دار ہی مل گئی منصور کو عرشی ورنہ،
 کون دیتا ہے محبت کا صلہ دنیا میں
 تسلیم مجھ کو خانہ کعبہ کی منزلت !!
 سب کچھ ہی مگر وہ تیرا آستان نہیں،

- ۱۔ دیوانگی عشق بڑی چیز ہے سیما ب
یہ ان کا کرم ہے جسے دیوانہ بنا دے
- ۲۔ اس بزم میں ہم سے کہتے ہیں موقع کے مطابق بات کر
اور ہم نے یہ دل میں ٹھانی ہے یا دل کی کہیں یا کچھ نہ کہیں
- ۳۔ سو بار تیرا دامن ہاتھوں میں میرے آیا !
جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے
- ۴۔ اے جو ہن جنوں بیکار نہ رہ کچھ خاک اڑا دیرانے کی
دیوانہ تو جتنا مشکل ہے صورت ہی بنا دیوانے کی
- ۵۔ ملنے کی یہی راہ نہ ملنے کی یہی راہ !!
دنیا جسے کہتے ہیں عجب راہ گزر ہے
- ۶۔ عشق کہتا ہے اس عالم سے جدا ہو جاؤ
حسن کہتا ہے جہاں جاؤ سیرا عالم ہے
- ۷۔ تڑپتی دیکھتا ہوں جب کوئی شے
اٹھالیتا ہوں اپنا دل سمجھ کر
- ۸۔ نہیں کالی گھٹا کا بھی نہیں یہ پانتا آتا !!
نشیمن سے دھواں اٹھتا ہے تم کہتے ہو ساون ہے
- ۹۔ آہ کیا یہ بھی اکنت لطیف ہے
لب تک آتے ہوئے ہنسی ہو جائے
- ۱۰۔ اے چشم اشکبار ذرا دیکھ تو سہی
یہ گھر جو جبل رہا ہے کہیں تیرا گھر نہ ہو
- ۱۱۔ اوج جھک جاتا ہے دل سلطانِ طبرہ کے حضور
جب حرم کی سرزمین پر سر کو خم کرتے ہیں ہم

- ۱۔ دھوکے میں آنے ہائیں کہیں نہ کر د آہی
آقائے کائنات لباس بشر میں ہے
- ۲۔ انھیں کی محفل سنوارتا ہوں چراغ میرا ہے رات انکی
انھیں کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات انکی
- ۳۔ یہ بزم ہے ہے یاں کو تاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں بیٹا اکی کا ہے
- ۴۔ دیکھ اس قوم کی تذلیل نہ مرنے پائے
اپنے ایوانوں میں اس قوم کی آواز ہے تو
- ۵۔ غیروں سے کہا تم نے غیروں سے سنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہو تا کچھ ہم سے سنا ہوتا
- ۶۔ تم غیاطب بھی ہو قریب بھی ہو
تم کو دیکھیں کہ تم سے بات کریں
- ۷۔ دل کے پھیلنے جل اٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے
- ۸۔ محبت کو سمجھنا ہے تو ناصح خود محبت کر
کنارے سے کبھی انداز طوفاں نہیں ہوتا
- ۹۔ سنا ہے حشر میں شان کرم بے تاب نکلے گی
لگا رکھا ہے سینے سے متاع ذوق عصیاں کو
- ۱۰۔ ہوتا ہے راز عشق و محبت یہیں سے فاش
ہنکھیں زباں نہیں ہیں مگر بے زباں نہیں
- ۱۱۔ یہ آستانِ یار ہے صحنِ حرم نہیں
جب رکھ دیا ہے سر تو اٹھانا نہ چاہئے

- ۱۔ بھر دسہ اس کو کتے ہیں گنہگاروں نے حشر میں
خدا کے سامنے ان کو پکارا، یا رسول اللہ
- ۲۔ کہاں داعی کہاں بے داغ دونوں کب برابر ہوں
نہ لالہ رنگ میں پایا چاندان کی صفائی میں
- ۳۔ چاند سے تشبیہ دینا کیا ہی انصاف ہے
چاند پر تو چھائیاں ہیں ان کا چہرہ صاف
- ۴۔ ہوش کی پہلے دو اکبر بعد میں شوق جود
یہ حبیب اور آستان رحمت للعالمین
- ۵۔ عشق احمد دیکھے میرا لڑکپن دیکھے
زلف کی زنجیر اور ننھی سی گردن دیکھے
- ۶۔ وہ ہر عالم کی رحمت ہیں کسی عالم میں ہ جالتے
یہ ان کی ہر بانی ہے کہ یہ عالم پسند آیا
- ۷۔ چارہ ساز بے کساں کچھ کو مسیحا جان کر
آگے در پر تیرے بیسار اٹھتے بیٹھے
- ۸۔ اس کا پتہ نہ پوچھو بس آگے بڑھے چلو
ہو گا کسی گلی میں تو میلہ لگا ہوا
- ۹۔ زمانہ کچھ کہے دیو الے اپنی جان دیدیں گے
مگر دامن نہ چھوڑیں گے تمہارا یا رسول اللہ
- ۱۰۔ کیوں رضا آج گلی سونی ہے
اٹھ میرے دھوم مچانے والے
- ۱۱۔ یہ اڑی اڑی سی رنگت یہ کھلے کھلے گیسو
تیری صبح کہہ رہی ہے تیسری رات کا فسانہ

- ۱۔ جب بھی آتا ہے میرا نام تیرے نام کے ساتھ
جانے کیوں لوگ میرے نام سے جل جاتے ہیں
- ۲۔ پوچھتے ہو شہر جیلاں کے فضائل آری
ہر فضیلت کے وہ جامع ہیں نبوت کے سوا
- ۳۔ کوئی سمجھے تو ایک بات کہوں
عشق تو فیتن ہے گناہ نہیں،
- ۴۔ ثابت ہوا جملہ فرائض شروع میں
اصل الاصول بندگی اس تاجور کی ہے
- ۵۔ مولا علی نے واری تیسری نیند پر نماز
اور وہ بھی عصر سب سے جو اعلیٰ خطر کی ہے
- ۶۔ در بدر کب تک پھر میں خستہ خراب
طیبہ میں مدفن عنایت کیجئے
- ۷۔ سب نے صف محشر میں للکار دیا ہم کو
اے بے کسوں کے آقا اب تیری دہائی ہے
- ۸۔ ارض مقدس ہے یہ طیبہ کی زمیں ہے
جنت بھی یہیں مالک جنت بھی یہیں ہے
- ۹۔ بے حجابی یہ کہ ہر ذرے سے جلوہ آشکار
اس پہ گھونگھٹ یہ کہ صورت آج تک نادر ہے
- ۱۰۔ یار تیرے حسن کو شبیہ دوں کس چیز سے
ایک تو ہی دیدہ بھاتی ہم کہ نادر ہے
- ۱۱۔ میری تصویر کے نقش ذرا غور سے دیکھ
اس میں ایک عہد کی تاریخ نظر آئے گی

- ۱۔ دُوبتے سورج سے پوچھا یہ ابھرتے چاند نے
 کب سے ریگ گرم پر رکھا ہے خسار حسین
- ۲۔ زندہ ہو جاتے ہیں جو مرتے ہیں حق کے نام پر
 اللہ موت کو کس نے سیسا کر دیا
- ۳۔ اسی شہیدِ ناز ہوں مردہ نہ جانے
 مگر کئی ہے زندگی جسا و داں مجھے
- ۴۔ کشنگانِ خنجر تسلیم رہا !!
 ہر زمان از غیب جانے دیگر است
- ۵۔ جانِ ہیادی ہوئی اسی کی تھی
 حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
- ۶۔ ادھر آؤ پیاسے ہنر آزمائیں
 تو تیرا تما ہم جگر آزمائیں
- ۷۔ ہو سکے تو لائے دو جہاں میزان میں
 میں نے ایک بحدہ زمین کر بلا سے لے لیا
- ۸۔ زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
 موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا
- ۹۔ ہر بواہو س نے حسن پرستی شعار کی
 اب آبروئے شیوہ اپنی نظر گئی
- ۱۰۔ اصل فتنہ ہے قیامت میں بہارِ فردوس
 جزیرے غیر نہ چاہے مجھے وہ دل دینا
- ۱۱۔ سنا ہے اس کو بھی غم ہے بہت جدائی کا
 مگر وہ شمس تمہاری طرح ادا نہیں

۱۔ پہونچا ہے عرش پر تن خاکی مصطفیٰ

کس شان سے زمیں گئی آسمان پر

۲۔ وہ سو جائیں تو معراج منافی

وہ جاگیں تو خدا سے ہم کلاری

۳۔ نہ پوچھو رفعت انسان کا عالم

وہاں پہونچا جہاں چلن پہ چسلن

۴۔ عش کوھا گئے کلیم مگر مہنس پڑے حبیب

آنکھیں بدل گئیں تو نظار ابدل گما

۵۔ وسیلہ بھی بڑی شے ہے خدا تک

میں پہونچا تو مگر دامن بدامن

۶۔ کرتے ہیں شب و روز مسلمانوں کی تکفیر

یہ کام ہے بیٹھے ہوئے بیکار نہیں ہیں

۷۔ کمانا مکان کے چھوٹے نقطو تم اول آخر کے پھر میں ہو

محیط کی چال سے تو پوچھو کہ ہر سے آئے کدھر گئے تھے

۸۔ وہی ہے اول وہی ہے آخر وہی ہے باطن وہی ہے ظاہر

اسی کے جلوے اسی سے ملنے ایسا ہے اس کی طرف گئے تھے

۹۔ تبارک اللہ شان تیری بھی کو زیبا ہے بے نیازی !!

کہیں تو وہ جو مشن تیری کہیں تقاضے وصال کے تھے

۱۰۔ ہے بے تاب جس کے لئے عرش اعظم

اسکدہ روئے لامکاں کی گلی ہے

۱۱۔ اللہ ربے تیرے جسم منور کی تابشیں

رعنا یوں میں ڈوب گیا پیر بن تمام

- ۱۔ اشرے خود ساختہ تانوں کا نیرنگ
جو بات کہیں فخر وہی بات کہیں ننگ
- ۲۔ اتنی نہ بڑھا پاکی داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بسند قبا دیکھ
- ۳۔ اک دل ہمارا کیا ہے آزار اس کا کشتا
تم لے تو چلتے پھرتے مردے جلا دیئے ہیں
- ۴۔ بد ہیں تو آپ کے ہیں بھلے ہیں تو آپ کے
ٹکڑوں پہ آپ کے ہیں پلے رخ کدھر کریں
- ۵۔ کلک رہتا ہے خنجر خوں خوار برق بار
اعدائے کمد و خیر منائیں نہ مشر کریں
- ۶۔ کسے مصطفیٰ کی اماغیں، کھلے بندوں اس پہ یہ جراتیں
کہ میں کیا نہیں ہوں محمدی، ارے ہاں نہیں بے ہاں نہیں
- ۷۔ ذکر و کے، فضل کاٹے، نقص کا جو یاں رہے
پھر کہے مردک کہ ہوں امت رسول اللہ کی
- ۸۔ سورج الٹے پائوں پلٹے چاند اشارے سے ہوجاک
اندھے نجدی دیکھ لے قدرست رسول اللہ کی
- ۹۔ دشمن احمد پہ شدت کیجئے
لمحہ دوں گی کیا مردست کیجئے
- ۱۰۔ مثل فارس زلزلے ہوں نجد میں
ذکر آباست و لا دست کیجئے
- ۱۱۔ وہ کمال حسن حضور ہے کہ گبان نقص جہاں نہیں
یہی پھول خار سے دور ہے یہی سمع ہے کہ صواں نہیں

- ۱۔ کوئی ان کی قبا کی بندشوں کو کچھ نہیں کہتا
میرا ذوق جنوں ہی مفت میں بدنام ہوتا ہے
- ۲۔ ہم آہ بھی کرتے ہیں تو مہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا
- ۳۔ تنکا بھی ہمارے تو ہلائے نہیں ہلنا
تم جا ہو تو ہو جائے ابھی کوہ عن بھول
- ۴۔ اہل غل کو ان کے عمل کام آئیں گے
میرا ہے کون تیسرے سوا آہ لے خبر
- ۵۔ رضا بی سے اب وجد کرتے گذرے
کہ ہے رب سلم خدا کے محسوس
- ۶۔ خدا کی رضا چاہتے ہیں دو عالم
خدا چاہتا ہے رضا کے محسوس
- ۷۔ دل کے جن کو لٹنے والا بستم ظریف
یادوں کو اپنی چھوڑ کے ہر چیز لے گیا
- ۸۔ میرے چہرے پر دکھائے کا تبسم ہے مگر
میری آنکھوں میں ادا اسی کے دیئے جلتے ہیں
- ۹۔ مونیج دریل سے یہ کہتا ہے سمندر کا سکوت
جس کا جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے
- ۱۰۔ عمر دراز مانگ کے لائے تھے چہار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں
- ۱۱۔ اے میری شام انتظار یہ کون آگیا ملے
زلفوں میں اک شب دراز آنکھوں میں کچھ کہانیاں

وہ
بہتر
ہے

- ۱۔ انہیں پتھروں پہ چل کر اگر آسکو تو آؤ !!
میرے گھر کے راستے میں کہیں کھٹاں نہیں ہے
- ۲۔ آہ وہ آنکھ کہ ناکام تمنا ہی رہی !
ہائے وہ دل جو تیرے در سے پر ارماں گیا
- ۳۔ عقل ہوتی تو خدا سے نہ لڑائی لیتے
بہ گھٹائیں اسے منظور بڑھا نا تیرا
- ۴۔ مٹ گئے مٹنے میں مٹ جائیں گے اعدائے
نہ مٹا ہے نہ مٹے گا کبھی چہر چائیرا
- ۵۔ ہر رنگے کو جو ای جاہ فی پورشن
من انداز غلطی میں شناسم
- ۶۔ چھٹ جائے اگر دولت کو بن تو کیا غم
چھوٹے نہ مگر ہاتھ سے دامن محسوس
- ۷۔ حشر کے دن میری چپ کا ماجرا
کہ نہ کہ تم سے بھی پوچھا جائے گا
- ۸۔ چہرہ کھلی کتاب ہے عنوان کچھ بھی دو
خس رخ سے بھی پڑھو گے بچے جان جاؤ گے
- ۹۔ آنکھیں رہیں گی شام و سحر منتظر تری
آنکھوں کو سونب دیں گے ترا انتظار ہم
- ۱۰۔ اس نامراد عشق کو منزل ملے بھی کیوں
جو تھک کے بیٹھ جاتا ہو کھو کر جو اس بھی
- ۱۱۔ باہر نہیں ہے اشک ابھی چشم تر میں ہے
آجاد گھر کی بات ابھی گھر کے گھر میں ہے

- ۱۔ بھر دسہ مشعلوں پر تا بجائے کارواں والو
خود اپنی روشنی میں کیوں نہ پہچانے مقابلا اپنا
- ۲۔ تصور سے کسی کے جگمگاتی ستارے میری
کسی کی باد سے روشن چراغ شام کرتا ہوں
- ۳۔ تو خود کو فرشتہ نہ سمجھ واعظ ناداں
دنیا میں تیرے رنگ کے انسان بہت ہیں
- ۴۔ یا تو دیوانہ بنے ، یا توجہ سے توفیق دے
ورنہ اس دنیا میں آکر مٹ کر آتا کون ہے
- ۵۔ یاد رکھو تو دل کے پاس ہیں ہم
بھول جاؤ تو فاصلہ ہے بہت
- ۶۔ گردن پہ اڑ رہا ہے پھر برا ہلال کا
جھنڈا گڑا ہوا ہے تیرا آسمان پر
- ۷۔ تم اپنے تغافل کا گلہ کیوں نہیں کرتے
کیوں دیتے ہو الزام میرے دیدہ نم کو
- ۸۔ اسد بسل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
تو مشق ناز کو خون و د عالم میری گردن پر
- ۹۔ مجبور ہوں کہ وقت ہے افشائے راز کا
گو میں یہ جانتا ہوں کہ تازک زمانہ ہے
- ۱۰۔ خون کے چھینے تیرے دامن پہ قابل کس طرح
قتل ہونے میں کوئی بے سئل اگر تڑپا نہیں
- ۱۱۔ ساحل کے سکون سے کسے انکار نہیں
طوفان سے لڑنے میں مزہ اور ہی کچھ ہے

- ۱۔ آجائے کہ آپ کو ترسے ہے اب نگاہ
دیکھا نہیں ہے ہم نے بہت دن گزر گئے
- ۲۔ اسی کشمکش میں گزری یہ حیات چند روز
کبھی دور رہ کے روئے کبھی پاس آ کے روئے
- ۳۔ یہ کس مقام پہ لائی ہے زندگی ہم کو
جہاں سے لوٹنا ممکن نہیں ہمارے
- ۴۔ کہاں ہے تو کہ تیرے انتظار میں اے دست
تمام رات سلکتے ہیں دل کے ویرانے
- ۵۔ اپنوں کی چاہتوں نے بھیا کیا دیئے قریب
روتے رہے پٹ کے ہر اک اجنبی سے ہم
- ۶۔ تمہاری دید ہی مقصد رہا جس کی بشار کا
وہ چشم منظر پھر اگئی کیا تم نہ آؤ گے
- ۷۔ آجائے کہ آپ کو ترسے ہے اب نگاہ
دیکھا نہیں ہم نے بہت دن گزر گئے
- ۸۔ ناحق ہے گلہ ہم سے اے جاہے شکایت بھی
ہم لوٹ کے آجائے، آواز تو دی ہوتی
- ۹۔ بہت سنجیدگی بھی جو س لیتی ہے لہو دل کا
اسی خاطر تو ہم زندہ دلی کو پیار کرتے ہیں
- ۱۰۔ وہ موسم حزاں ہو کہ رات ہو بھار کی
عادت سی بڑ گئی ہے تیرے انتظار کی
- ۱۱۔ اے حاصل خلوص بتا کیا جواب دوں
دنیا یہ پوچھتی ہے کہ میں کیوں اداس ہوں

—۔ وہ ہر عالم کی رحمت ہیں کسی عالم رو جاتے
 یہ ان کی ہر بانی ہے کہ یہ عالم پسند آیا
 —۔ جان و دل ہوش و خرد سب تو مدد بخشنے
 تم نہیں چلتے رخصت سارا تو سامان گنا
 —۔ گناہوں سے پشماں دیکھ کر اے داؤد مختار
 تیری رحمت نے دھو ڈالا میرے دہلیز عصیا کو
 —۔ منظور ہے گزارش احوال واقعی
 اپنا بیان حسن طبیعت نہیں مجھے
 —۔ بدل کو فقیروں کا ہم بھیجیں غالب
 تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں
 —۔ رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا کے تھانے میں !!
 کہ اکبر نام یستاسے خدا کا اس زمانے میں
 —۔ ادھر آؤ پیارے ہنسند آزمائیں
 تو تیرا آزمائیں ہم جگر ، آزمائیں
 —۔ ہو سکے تو لایے دونوں جہاں میزان میں
 میں نے ایک سجدہ زمین کر بلا سے لے لیا
 —۔ تیری نسل پاک میں ہے بچہ بچہ نور کا
 تو ہے عین نور تیرا سب گھرا نا نور کا

—۔ عشق کھا گئے کلیم مگر ہنس پڑے حبیب
 آنکھیں بدن گئیں تو نظارہ بدل گیا

مالک کو نین ہیں گو پاس کچھ رکھتے نہیں
دو جہاں کی نعمتیں ہیں ان کے خالی ہاتھ میں

فرش والے تیری شوکت کا علو کیا جانیں
خسر و اعرش پہ اڑتا ہے پھر براتیرا

دیوانگی عشق بڑی چیز ہے سب سے
یہ ان کا کرم ہے جسے دیوانہ بنالیں

دینے والے مجھے دینا ہے تو اتنا دیدے
کہ مجھے شکوہ کوتاہی داماں ہو جائے

نگہ بلند سخن دلنواز، جاں پر سوز
ہی ہے رحمت سفر میر کارواں کیلئے

ایک پتھر میں سمٹ کر رہ گئیں
حکمتیں، دانا کیاں، آگاہیاں

ایک زبردست کی ٹھوکر میں ہیں
شاہیاں، سلطانیاں، دارائیاں

مالک کو نین ہیں گو پاس کچھ رکھتے نہیں
دو جہاں کی نعمتیں ہیں ان کے خالی ہاتھ میں

فرش والے تیری شوکت کا علو کیا جانیں
خسر و اعرش پہ اڑتا ہے پھر براتیرا

دیوانگی عشق بڑی چیز ہے سب سے
یہ ان کا کرم ہے جسے دیوانہ بنالیں

دینے والے مجھے دینا ہے تو اتنا دیدے
کہ مجھے شکوہ کوتاہی داماں ہو جلے

نگہ بلند سخن دلنواز، جاں پر سوز
ہی ہے رحمت سفر میر کارواں کیلئے

ایک پتھر میں سمٹ کر رہ گئیں
حکمتیں، دانا کیاں، آگاہیاں

ایک زبردست کی ٹھوکر میں ہیں
شاہیاں، سلطانیاں، دارائیاں

نہ پوچھو رفعتِ انساں کا عالم وہاں پہنچا جہاں چلن پہ چلن
وسیلہ بھی بڑی شے ہے خدایا میں پہنچا تو مگر دامنِ بدامن
وہ جس کا بچھو ناتھا کھجوروں کی چٹائی

سلطانِ عرب ہے وہ سلطانِ عجم ہے
آسان ہے ہر منزل دشوارِ نظائی

ہاتھوں میں جو سرکار کا دامنِ کرم ہو
بھڑک جاتی ہے جب یہ آگ تو بجھنے نہیں پاتی

جراغِ عشق جل جاتا ہے تو مدھم نہیں ہوتا
کسی کارا ز رکھنے کو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے

کہ آنسو جھلسا جاتے ہیں دامنِ خم نہیں ہوتا
بے ہی درسِ محبت ہے ہی رسمِ وفا آدمی کو آدمی کا علم اٹھانا چاہئے
میرے سجدے تیرے سنگِ در کے گر قابل نہیں

بخش دے اپنے کرم سے ذوقِ زندانِ مجھے
غیرتِ اہماں کہاں سوئی ہے اٹھ کر دیکھ لے

لے چلی ان کی محبت سوئے بتِ خسانِ مجھے
زندگی کاٹے نہ کٹی آرزو کی چھاؤں میں

ہو گئی آسان خود بے مدعا ہونے کے بعد
اپنے کو مٹا دے جو رہِ عشقِ دونا میں

یہ ذوقِ بہت خاص ہے کچھ عام نہیں ہے
کیا کسی منصور و سرمد نے کہیں آواز دی

آج ان کی ہر گلی میں کس کا قتلِ عام ہے
خود کام آئے نہ آئے تو کیا علم، جنوں میرا اب میرے کام آگیا ہے

سلامت ہے آبرو اشکب غم کی
 محبت میں اکثر یہ کام آگیا ہے
 کبھی بھولے بھٹکے جو یاد آ گئے ہم
 سلام آگیا ہے پیام آگیا ہے
 نظامی یہ دار و رسن کی ہے منزل
 انصواب تہا را مقام آگیا ہے
 میری آرزو تھی انھیں ہم جو پاتے گلے مل کے روتے غم دل سنانے
 نہ جاتے ہو کیا انھیں دیکھتے ہی قدم دکھائے تو لب ہفتہ کھراے
 فقروں سے نہ بھجوان کی دنیا ہی برا کی ہے
 یہ گدڑی میں تو رہتے ہیں مگر گوہر لٹاتے ہیں
 اب ہجر مسلسل سے میرا حال برا ہے
 آجاد کہ ہر لمحہ قیامت کی گھڑی ہے
 ہم خاک شینوں کی ہر ایک بات ہے کمتر
 وہ کچھ بھی کہیں ان کی ہر ایک بات بڑی ہے
 ان کا دامن چھوڑ کے سجدہ کیا تھا آپ نے
 اپنی پیشانی کا اب تو داغ عصیاں دیکھے
 میری دنیا سے تنہا ہر طرح آباد ہے
 اک نہ تم کو پاس کے بہ آرزو باقی رہی
 نصیب میرے دل کا دیکھنے والو ذرا دیکھو
 لئے جاتا ہوں نذرانہ معین الدین چشتی کا
 دو گل ہیں ہیک ہیں وہ شفق ہیں وہ چمک ہیں
 ان لفظوں میں پوشیدہ ہے تفسیر کسی کی

نہ پھر ہے نہ آہن ہے بڑی نازک لمانت ہے
 اشاروں سے بھی دل کا آبگینہ ٹوٹ جائیگا
 نہ سایہ ہو جس کا مگر آدمی ہو

مدینہ میں ایسا بشر دیکھ جاؤ
 آئے جو دم آخر سانس اپنی پلٹ آئی

کام آہی گئی آخر آج ان کی مسیحائی

تقصیر میری کیا ہے اسے میرے کرم فرما

قدموں میں رہا لیکن دل میں نہ جگہ پائی

دل کا سکون آنکھ کی ٹھنڈک کہو جسے

وہ پرکشش حسین نظارہ چلا گیا

آزار یہ ایسا ہے سلگ جائے میری زلیبت

یہ دیس تو اپنا ہے، کوئی اپنا نہیں ہے

تہیں کھو کے محسوس ایسا ہوا

کہ جیسے ہو کوئی خط زندگی

یہ آنکھ کے آنسو ہیں کہ سادہ کی جھڑی ہے

جب سے وہ گیلے ہے مجھے کہہ ہوش نہیں ہے

پھول سے نازک مزاج عشق اپنا ہے حضور

دشمنوں کے حق میں ہے تلوار اپنی زندگی

سرے گھر کے وہ دن بھی کتنے بھلے تھے

کبھی ان کا آنا کبھی ان کا جانا

اک اس ہے شاید کہ وہ گزریں گے ادھر سے

ہیں بیٹھا ہوا راہ گزر دیکھ رہا ہوں !!

دنیا نے میرا حال بڑے پیار سے پوچھا
 تم بھی تو کبھی پوچھو کہ دن کیسے گزائے
 نہ روند و خاک پر روانہ نشانِ عشق رہنے دو
 کہیں تم سے نہ لے بدلہ بڑا ظالم زمانہ ہے
 مجھے در بدر پھر ایسا تیری جستجوئے آخر
 تیرا آستان جو پایا مجھے مل گیا ٹھکانہ
 یہ جلے جلائے تنکے جو نشانِ غم بنے ہیں
 مرا کون رہ گیا ہے جو سرے آتیاں پہرے
 پل رہی ہے ایک دنیا تیرے در کی بھیک سے
 کون ایسا سر پھر ہے جو یہاں سائل نہیں
 اس کی رحمت کو پیار آئے
 ایسا کوئی گناہ کر لو !!
 شاید کہ ترس آجائے
 مجھ پر بھی ایک نگاہ کر لو
 پس کرو نہ تم ہو
 مجھ کو اس پر گواہ کر لو
 تاکہ ڈھونڈ میں شفیقِ محشر
 اپنا دامنِ سیاہ کر لو
 بے قراری، آہ زاری اسر د آہیں، اشکِ غم
 اور کیا کیا چاہتے ہو اپنے دیوانے سے تم
 زندگی کا راز افشا ہو گیا
 ان کو دیکھا اور آنسو بہ گئے

اختتامِ تقریر

طوفانِ نوح لائے اے اے چشمِ فائدہ
ددا شکستہ ہی بہت ہے اگر کہو اثرِ کسے

رقعتِ لطیف ابھی ناتمام ہے
جو کچھ جوابِ بیان وہ آغازِ بابِ مرقا

جمالِ باری کی رعنائیاں ادا نہ ہوئیں
ہزار کام لیا میں نے خوش بیاہی سے

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مرد ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

اپنی تو اب تمام ہوئی کائناتِ غم
ددا شکستہ تھے سودیدہ تر سے گزریں گے

ابھی اور زندگی دے کہ ہے داستانِ ادھوری
میری موت سے نہ ہو گی کبھی داستانِ پوری

ان کو صرف آنسو نہ سمجھو دوستو
 داستانِ زندگی یہ کہہ گئے
 اس کے بگڑے ہوئے کام سب بن گئے
 جس نے دل سے پکارا منور علی
 آسمانِ ولایت کا سب کچھ کہو
 چاند سورج ستارہ منور علی
 ان کے رنجِ زیبا کو ابھی دیکھ رہا ہوں
 اے موت ذرا رک جا ابھی سانس ٹوٹے
 محشر کی ہولناک مصیبت میں نہ سارا
 اے سیدِ لولاک کبھی ساتھ نہ چھوٹے
 اس اشک کی قیمت کی کوئی حد ہی نہیں ہے
 تقدیر سے جو دامن سرکار پہ ٹوٹے
 شبیر یہ کہنے سے میرے چاند ستارو
 گرجانِ چلی جائے پر میدان نہ چھوٹے
 رویا ہے نظامی نے کہیں خون جگر سے
 دامن پہ نظر آتے ہیں جو بیل اور بوٹے
 اے جنت تمام ترے لطف و کرم سے
 طیبہ میں میرے واسطے دو گز کی زمیں ہو
 ناکام تمنا ہوں مگر آہیں بندھی ہے
 سنگِ درجائیاں پہ کبھی میری جبین ہو
 اللہ کے لبِ اسے نبوت کا بہ اعجاز
 جوابات وہ فرما میں وہ قرآن میں ہو

گرم آنسو سرد آہیں داغ دل خون جگر
 یہ متاعِ عشق لایا ہوں تمہارے دیں میں
 سجدہ وہ راہبگاں ہے عبادت ہے سب فضول
 جب تک شعورِ عشق نہ ہو بندگی کے ساتھ

کندہ ہے ان کا نام میرے نام ہی کے ساتھ
 عظمت تو دیکھئے میرے لوحِ مزار کی !!
 سو سو طرح سے دل کو تسلی دیا مگر
 ننداں نہ ہو سکا دل ویراں تبرجے بغیر

اشک بن کر ڈھل رہا ہے خونِ دل خونِ جگر
 یہ متاعِ عشق ہے پانی نہیں شبنم نہیں
 ایک پردانے کے جلنے پر نہیں ہے منحصر
 حسن کی کس آنکھ میں عشق کا ماتم نہیں

میری آباد دنیا کو نہ روند واپس قدموں سے
 تمہیں دل میں بٹھایا ہے نہ جانے کتنے ارماں سے
 غم جاناں تو ابھی جا کہ تیرا ہی سہارا ہے
 میرا دل ڈوبا جاتا ہے خیالِ شامِ بھراں سے

میرا دل ہی نہیں سارا زماں کا نپ اٹھتا ہے
 ستارے ٹوٹے ہیں جب تمہاری ٹوکی مرگیاں سے

یہی ایک دن زمانے کی قیادت کرنے والے ہیں
 جو دیوانے ابھی اکچھے ہیں جیب و داماں سے
 سرخروئی، سرفرازی، سر بلندی واہ واہ
 ان کے قدموں سے لپٹ جانے کا ترہ دیکھے

مردوں خاموش تھا میں آج ہی کے واسطے
 دیکھنا ہے کون ٹکراتا ہے اس طوفان کے
 اے نظائی چھوڑ دے افسانہ شعرو سخن
 یہ تیری منزل نہیں اور یہ تیرا عالم نہیں

اکیلا ہوں مگر آباد کر دیتا ہوں ویرانہ
بہت رشتے کی میرے بعد میری شام تنہائی

اے گردِ دیش زمانہ کبھی راہِ بگاں نہ کرنا
ہیں بہت لطیف و نازک غم دل کی داریاں

یہ تو اپنا اپنا ہے حوصلہ یہ تو اپنی اڑان ہے !
کوئی اڑ کے رہ گیا ہاں تک کوئی ہنکشاں سے گزر گیا

کہتے ہی کہتے عمر گزر جائیگی میری
ان کا بیان ہے یہ کوئی داستان نہیں

اُس درے تصورِ جاناں کی لذتیں
دیکھائے ہم ان کو جہاں تک نظر گئی

احساس کی شدت کا یہ کیسا تماشا ہے،
سیراب ہوں میں لیکن مجھ میں کوئی پیاسا ہے

ہے نکمیں کہیں تو جاگ اٹھیں حسرتیں تمام
اس کو بھی کھو دیا جسے پایا تھا خواب میں

آرزوئے دل

جانِ دل ہوش و خرد سب تو دیکھ پہونچے

تم نہیں چلتے رضا سارا تو کا مان گیا

(سیدنا امام احمد رضا)

اخیر وقت سے آرتھی چلو مدینے کو

نثار ہو کے مرو تربتِ پیمبرؐ

(سرکارِ اہلبی)

مٹی نہ ہو بڑا باد پس مرگ سے الہی،

جب خاک اڑے میری مدینہ ہوا و

(جناب میر)

عشر کی ہولناک مصیبت سے میں تمہارا

اے سیدِ لاک و کبھی ساتھ نہ چھوڑے

دلائل

دوہین چارہن

آج کا عنوان بہت ہی خشک اور خالص علمی ہے، فردی مسائل پر
محض قرآن و حدیث کی دلیل طلب کرنے والوں کیلئے یہ کوئی بھی پھلکی تقریر نہیں
بلکہ تازیانہ عبرت ہے۔

اگر سامعین نے انشراح صدر اور بھرپور توجہ سے سماعت فرمایا،
تو ایقان و اذعان کی بلند چوٹی سے ہر ایک اعلان کرے گا کہ یہ محض مقرر
بنانے والی نہیں، مناظر بنانے والی تقریر ہے۔

اب اتنی ہی ہوتی صورت کے ساتھ نہیں ہشاش و بشاش
چہرے کے ساتھ بیٹھئے۔ اور اس کا ایک ایک گوشہ
محفوظ رکھئے تاکہ آپ اندھیرے سے اجالے میں
آسکیں۔ اور اس حقیقت کو بھی بخوبی سمجھ سکیں

کہ مناظر کیلئے — اور —
مناظر —
کیسا ہے؟

الحمد لله وكفى وسلا على حبيبه الذي
اضطف

آمنا بعنك

فاعوذ بالله من الشيطان الرجيم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ

اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور حکم والوں کی جو تم میں سے ہوں۔
حضرات! آج میری تقریر کا عنوان ہے "مسائل کے ثبوت میں
دلائل دو نہیں بلکہ چار ہیں۔

ہم اہلسنت وجماعت کے بہت سے معمولات و مراسم ہیں اپنے اپنے
موقع و محل پر جن مراسم کی ادائیگی ہوتی رہتی ہے۔ انہیں ہم فرائض و واجبات
میں شمار نہیں کرتے۔ نہ ہمت دین کہتے ہیں، نہ اساس دین۔ ان میں سے اکثر کی
کی حیثیت مباح، مندوب، مستحب اور تحسن کی ہے یا اس سے کچھ زائد کی۔

مثلاً ہم میلاد شریف کرتے ہیں اور ۱۲ ربیع الاول کو جلوس عید میلاد
انبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اہتمام کرتے ہیں۔ ہر چند کہ یہ ہمارے معمولات میں ہیں لیکن
ہم اسے فرض و واجب کی صورت نہیں دیتے۔ بلکہ یہ ہم نیاز مند غلاموں کے
طرف سے اپنے آقا کی بارگاہ میں خراج عقیدت ہے۔ گو یا یہ عیاری غلامی کی نشانی
ہے۔ جلوس کا اہتمام آپ کے یہاں ہوتا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو اس کا اہتمام کیجئے۔

بات آہی گئی ہے تو میں یہاں پر دو محفلیں عید میلاد النبیؐ اور "جلوس عید میلاد النبیؐ" صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ایک واضح فرق بیان کرتا چلوں۔

محل میلاد میں مقرر اور خطیب مسلمانوں کو مخاطب کرتا ہے چونکہ مجمع خوش عقیدہ مسلمانوں کا ہی ہوتا ہے لیکن جلوس میں ایسا نہیں ہے جلوس تو ایک ایسی شاہراہ سے گذرتا ہے جس کے ارد گرد فٹ پاتھ وغیرہ پر نہ جانے کتنے غیر مسلم الگ الگ مذاہب کے کھڑے رہتے ہیں۔ مثلاً بھی ایک بین الاقوامی شہر ہے جہاں قریب قریب بنام اسلام و مسلمان، سارے فرقے پائے جاتے ہیں ایسے ہی پوری دنیا میں مختلف مذاہب قومیں آباد ہیں جس وقت جلوس عید میلاد النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم نکلتا ہے تو شہر کی اکثر قومیں مسلمانوں کا سر ہی سر دیکھ کر حیران رہ جاتی ہیں کہ آیا یہ کون سا دن ہے کہ مسلمان اپنے گھروں میں تالا لگا کر باہر نکل آیا ہے۔ لہذا نہ جاننے والے جاننے والے سے معلوم کرتے ہیں۔ آج کون سا دن ہے کہ مسلمان دیوانہ وار گھروں سے باہر نکل آیا ہے، اب نہ جاننے والوں کو جاننے والا بتاتا ہے کہ آج ہی کا وہ مبارک و مسعود دن ہے جس میں مسلمانوں کے پیغمبرؐ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے تھے۔ آج مسلمان ان کا جنم دن اور یوم ولادت منارہے۔ تو دنیا کی حساس قومیں ہمارے بارے میں خیال کرتی ہیں کہ یہ عجیب و غریب قوم ہے کہ یہی بھارت میں ہے اور دامن مدینے والے کا تھا ہے۔ پھر اس کے بعد ان کو اس کا یقین ہوتا ہے کہ جب اس قوم نے اپنے "نبی" صلی اللہ علیہ وسلم کو فراموش نہ کیا تو ان کا نبی ان کو کیسے بھول سکتا ہے۔ یقیناً ان کی روحانیت اور فیض بخشی ان کے کام آتی ہوگی۔ اور ہماری ہی اذہا ہمارے زندہ قوم ہونے کی علامت و نشانی ہے۔ بہر حال میں کہہ یہ رہا تھا کہ ہم اہل سنت کے بہت سے ایسے معمولات و مراسم ہیں جن کی حیثیت فرائض و واجبات کی نہیں ہے لیکن ہمارا حریف اس کے نبوت میں قرآن و حدیث کی دلیل مانگتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ سب قرآن و

حدیث سے ثابت کرو۔ اگر قرآن میں نہ دکھلا سکو تو کم از کم یہی کہیں دکھلا دو کہ رسول نے اپنی قوم سے کہا ہو کہ میری میلاد کرنا۔ اگر ہم کو یہ دکھلا دیا جائے تو ہم بھی میلاد شریف کرنے لگیں

ابتدائی مرحلہ میں ہمارا ان سے یہ کہنا ہے کہ میلاد شریف سرکار کے کہنے کی چیز نہیں بلکہ غلاموں کے کرنے کی ہے۔ یہ سوال تمہاری بوجھلاہٹ، قلبی پراگندگی اور ذہنی آوارگی کا نتیجہ ہے۔

تہیں یہ سمجھنا چاہیے کہ آقائے کائنات کی تاریخ صرف مسلمان ہی نہیں پڑھتا بلکہ دنیا کی اکثر قومیں پڑھتی ہیں۔ تمہارے مطالبے کی روشنی میں اگر کہیں رسول اللہ نے اپنی قوم سے فرمایا ہو تا کہ میرا میلاد کرنا، تو دنیا کی یہی قومیں ہمارا گریبان مقام یمنیں کہ مشتاق نظامی! کیا اسی رسول کا گن گار ہا تھا جو اتنا اقتدار پسند تھا کہ اپنے میلاد کی اپیل خود ہی اپنے قوم سے کیا کرتا تھا سید عالم روحی فدائے صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس حقیقت پر بہت اچھی طرح مطلع تھے کہ "میلاد" میرے کہنے کی بات نہیں بلکہ غلاموں کے کرنے کی بات ہے یہ بات آپ کے مشاہدات میں ہے کہ بڑے بہت سی باتیں اپنے چھوٹے سے کہتے ہیں مگر عقیدت کیش ان کا زناموں کے انجام دہی میں بڑے کے حکم کا انتظار نہیں کرتے بلکہ بغیر کے خود ہی پیش قدمی کرتے ہیں۔

مثلاً ہماری خوش نصیبی ہے ہم سب کے آقائے نعمت حضور سرکارِ مفتی اعظم ہند رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی حیات ظاہری میں رونی اسٹیج ہوئے اور مجلس ختم ہوتے ہی اٹھے کا ارادہ فرماتے تو کوئی عصا پیش کرتا، کوئی جوتا سیدھی کرتا، کوئی رومال بڑھاتا، کوئی پان کا ڈبہ منسجالتا، غرضیکہ خوشنودی مزاج کی خاطر ایک ایک کو بغیر حکم پائے ہر ایک اپنے اپنے کام میں لگ جاتا۔ کوئی اس کا انتظار نہیں کرتا کہ حضرت فرمائیں تو عصا حاضر کیا جائے، حضرت حکم دیں تو پان کا ڈبہ لایا جائے۔ ایسا کیوں ہے؟ جوں کہ ان میں سے ہر نیاز مند

یہ جانتا ہے کہ یہ حضرت کے کہنے کی بات نہیں ہے بلکہ ہم غلاموں کے کرنے کی بات ہے۔ میرے خیال میں یہ کچھ ہمارے ہی یہاں کا دستور نہیں ہے ان کا بھی اپنے بڑوں کے ساتھ یہی شیوہ ہو گا لیکن وہاں شرک و بدعت کی پیروی نہیں کھلتی۔ ترکش کے یہ سارے تیر وہیں پھینکے جاتے ہیں جہاں احترام نبوت اور عظمت مسال کا سوال ہوتا ہے۔

بہر حال! اگر یہ اپنے ہوش میں ہوتے تو ایسا سوال ہرگز نہیں کرتے یہ تو تہیدی خاکہ تھا یا عنوان سے متعلق ایک ذیلی گفتگو۔ اب آئیے اصل موضوع سے متعلق گفتگو ہو جائے۔

عنوان یہ ہے کہ ”مسائل کے ثبوت میں دلائل دو نہیں بلکہ چار ہیں“ اس سلسلے میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ہمارے معمولات و مراسم سے متعلق ہمارا حریف قرآن و حدیث کی دلیل مانگتا ہے جس سے اس کا یقین ہوتا ہے کہ اس کی نظر میں دلیلیں صرف دو ہی ہیں۔ اس لئے کہ اگر وہ دلائل کو تسلیم کرتا تو صرف قرآن و حدیث ہی کا نام نہیں لیتا۔ بلکہ دلائل کی فہرست میں اور بھی ذکر کرتا مگر ایسا نہیں ہے بلکہ وہ جب بھی دلیل مانگتا ہے تو صرف قرآن و حدیث ہی کا نام لیتا ہے اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ آج آپ کو یہ حقیقت سمجھا دی جائے کہ دلائل دو نہیں بلکہ چار ہیں۔

ابھی آپ ذہن کی حاضری کے ساتھ تشریف رکھئے۔ آج کی گفتگو کمٹن اور سخت ہے۔ عوامی نہیں بلکہ درس گاہی تقریر ہے۔ اگر جی لگا کر آپ نے اس کو سمجھ لیا تو مقرر نہیں بلکہ اچھے خاصے مناظر آپ ہو جائیں گے۔

حضرات! دلائل دو نہیں بلکہ چار ہیں۔ اب ان کو ذہن نشیں فرمائیں۔
(۱) کتاب اللہ (قرآن) (۲) سنت رسول اللہ (حدیث) (۳) اجماع امت
(۴) قیاس مجتہد۔

یہ عجیب طرفہ تماشہ اور جبرت انگیز بات ہے کہ میلاد و قیام پر محض قرآن

و حدیث کی دلیل طلب کرنے والے اپنی اپنی درسگاہوں میں اپنے طلبہ کو انہیں چار دلائل کو پڑھاتے ہیں۔

چنانچہ اصول فقہ کی ابتدائی کتاب ”نور الانوار“ کا متن ان اصول الشرع ثلثة کتاب اللہ و سنتہ رسول اللہ واجماع الامة والاصل الرابع القیاس۔

یہ کتاب ان کے یہاں بھی داخل نصاب ہے یعنی اصول شرع چار ہیں۔ قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس۔ اب مجھے دریافت کر لینے دیجئے کہ وہ کونسا داعیہ ہے کہ درسگاہ میں طلبہ کو چار دلیلیں پڑھائی جائیں اور میلاد شریف کو لے والوں سے محض دو دلیلیں مانگی جائیں۔

طلبہ! کھو تو رہے جس کی پروردہ داری ہے اس مختصر سی گفتگو نے بہر حال آپ کو اس نتیجہ تک پہنچا دیا ہو گا کہ گلے کی رگیں پھلا پھلا کر میلاد و فاتحہ کی دلیل مانگنے والے یا تو فریب خوردہ ہیں یا فریب دہندہ۔ بہر حال دونوں کے یا کسی ایک کے مریض ہیں۔ پھر آپ ہی بتائیے کہ ایسے فری کو کس طرح منہ لگایا جائے۔ لیکن اپنے احباب و عوام کو سمجھانے اور مطمئن کرنے کی خاطر بہ ساری زحماتیں اٹھانی پڑیں۔

حضرات! چند باتیں پہلے ذہن میں نوٹ کر لیں تب گفتگو آگے بڑھائی جائے۔ (۱) دلائل دو نہیں بلکہ دلائل چار ہیں۔ قرآن، حدیث، اجماع امت قیاس مجتہد۔

(۲) جیسا دعویٰ ہو ویسی دلیل مانگی جائے یعنی اگر قرآن کا دعویٰ ہو تو قرآن سے دلیل مانگی جائے۔ اگر قیاس کا دعویٰ ہو تو قیاس سے دلیل مانگی جائے۔

(۳) دلیل کا فراہم کرنا منکر کی ذمہ داری ہے یعنی منکرین قیام کو دلیل دینی پڑے گی کہ قیام کیوں نہ کیا جائے؟ قیام کرنے والے سے دلیل نہیں مانگی

صرف یہی کہلے کہ واسمہوا بربیکم تم لوگ اپنے سروں کا مسح کرو مگر قرآن نے کوئی مقدار نہیں متعین کی۔ پورا۔ آدھا۔ تہائی۔ چوتھائی۔ بلکہ آیت مطلق ہے بس اتنا ہی حکم ہے کہ اپنے سروں کا مسح کرو۔

اب آئیے بارگاہ رسالت میں جس کا قول و فعل قرآن کے اجمال کی تفصیل ہے۔ صحابی رسول حضرت مغیرہ بن شعبہ اس کے راوی ہیں فرماتے ہیں اخ سباطہ فمرفبال وتوضاء ومسح علی ناصیۃ۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وسلم قوم کے کوڑے خلعے پر تشریف لائے اور استنجا فرمایا پھر وضو فرمایا اور چوتھائی سر کا مسح کیا۔

معلوم ہوا مسح کی فرضیت قرآن سے لی جائے گی مگر اس کی مقدار کا تعین فعل رسول سے۔ اگر اللہ کے رسول کا وضو نہ دیکھا جائے تو وہ تمہاری خواہش نفس کا وضو ہوگا۔ من مانی بلا دلیل ہوگا۔ یعنی وہ شری وضو تو ہوگا مگر شرعی وضو نہ ہوگا۔

بس دعویٰ داران اہل قرآن سے کہہ دیجئے کہ حدیث رسول دیکھئے بغیر جب وضو میں سر کا مسح تک نہیں کر سکتے۔ تو بھلا بیع و شرا، نکاح و طلاق روزہ و نماز، حج و زکوٰۃ جیسے بے شمار پھیلے ہوئے مسائل ہیں۔ حدیث کریمہ کو ایسے مسائل کا حل کیسے تلاش کیا جاسکتا ہے؟

حضرات! معلوم ہوا۔ قرآن اصل الاصول تو ضرور ہے مگر اس کی تشریح و تفصیل کے لئے حدیث کو دلیل بنانا بہت ضروری ہے۔ ورنہ زندگی کے بے شمار مسائل میں بریک لگ جائے گی۔ اور تعطل پیدا ہو جائے گا۔ اور یہ زندگی و بال جان اور دو بھر ہو جائے گی۔ بظاہر دعویٰ بہت اونچا ہے مگر اس سے کہیں زیادہ اس کا کھوکھلا پن بھی آشکارا ہے۔

اور آگے بڑھئے اہل قرآن کے بعد دوسرے فرقے نے سراٹھایا

جائے گی۔

(۴) صرف دلیل کہدینا کافی نہ ہوگا بلکہ وہ دلیل جو مثبت مدعا ہو یعنی اسی دلیل جس سے دعویٰ اور مدعا ثابت ہو۔
آنے والی گفتگو سے پہلے ان اصولوں کا ذہن نشین رکھنا بہت ضروری ہے۔

حضرات! میں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ مسائل کے ثبوت میں دلائل دو نہیں بلکہ چار ہیں۔ اب اس کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے۔
مثلاً ایک فرقہ ہے "اہل قرآن کا" اس کا کہنا یہ ہے کہ قرآن کے ہوتے ہوئے ہمیں کوئی دلیل نہیں چاہئے۔ بظاہر یہ دعویٰ بہت بھاری بھر کم جاذب نظر، پرکشش اور با وزن معلوم ہوتا ہے لیکن ایسی غیر معقولیت اور گھوکھلا پن شائد ہی آپ کو کہیں اور مل سکے۔

ان سے کہئے زندگی کے ہزار ہا مسائل تو آپ ایک طرف کر دیجئے۔ اگر آپ صحیح معنوں میں "اہل قرآن" ہیں۔ تو قرآن ہی کی روشنی میں صرف "وضو" کر کے دکھا دیجئے جسے وضو کہا جاسکے۔

وہ سب سے پہلے ہاتھ دھوئیں گے۔ ان سے دریافت کیجئے کہ جناب! قرآن نے تو یہ کہا ہے کہ سب سے پہلے منہ دھوؤ۔ یہ ہاتھ کیوں دھویا جا رہا ہے۔

(۲) پھر وہ کلی کریں گے۔ دریافت کیجئے۔ قرآن میں کہاں ہے کلی کرنا۔ (۳) وہ ناک میں پانی ڈالیں گے، دریافت کیجئے قرآن میں کہاں ہے ناک میں پانی ڈالنا۔ (۴) وہ مسح کریں گے ان سے دریافت کیجئے مسح کی مقدار کیا ہوگی۔ پورا سر کہاں ہے۔ قرآن میں آدھا سر کہاں ہے قرآن میں؟ تہائی سر کہاں ہے قرآن میں، چوتھائی سر کہاں ہے قرآن میں؟ مجبوراً تم کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا وضو دیکھنا ہوگا۔ قرآن نے تو

ہم اہل حدیث ہیں! جس کا کہنا یہ ہے کہ قرآن و حدیث کے ہوتے ہوئے کوئی دلیل نہیں چاہئے۔

حضرات! یہ گزشتہ صدی کی پیداوار ہیں پہلے تو یہ "مہری" تھے۔ پھر اہل حدیث ہوئے۔ اب سلفی: "آئندہ دیکھے" کیا چولا بستے ہیں۔ چونکہ یہ غیر مقلد ہیں۔ سو نچتے ہوں گے کہ اگر ایک ہی نام رہا تو تقلید کی بہت گہری چھاپ لگ جائے گی: لہذا اپنی "غیر مقلدیت" کی حفاظت کی خاطر کچھ دنوں کے بعد اپنا نام بدل دیتے ہیں۔

یہ بار بار نام تجویز کرنا، پھر بدل دینا، پھر تجویز کرنا، پھر بدل دینا یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ پرانے نہیں بلکہ نئی پیداوار ہیں۔ جوانوں اور بوڑھوں کا نام نہیں بدلا جاتا۔ چھوٹے بچوں کے نام میں ابتداءً تبدیلی ہو جاتی ہے۔ دادا نے کچھ نام رکھا۔ نانا نے دوسرا نام اور بعض دوسرے گھر والوں نے تیسرا۔

اب ان نام نہاد اہل حدیث یعنی غیر مقلدین سے دریافت کیجئے کہ اگر حدیث کے بعد آپ کو کوئی دلیل نہ چاہئے تو یہ بتائیے کہ قرآن نے سود سے متعلق کہا ہے وحسبہم الربوا لین دین میں زیادتی سود ہے۔ سرکار نے چند چیزوں میں اس کی تفصیل بتا دی۔

الحنطة بالحنطة الشعير بالشعير الذنب بالذنب

الفضة بالفضة الملح بالملح النمر بالنمر -

سرکار نے ان اشیاء کو شمار فرمایا۔ اب اگر کوئی کہے کہ حضور نے گہیوں اور جو کا ذکر فرمایا۔ چنا، مٹر، چاول، سرسوں وغیرہ کا ذکر نہیں فرمایا لہذا ان اشیاء میں سود لینا دینا دونوں درست ہو گا۔

اب فرمائیے! اگر آپ صحیح معنوں میں سلفی اور اہل حدیث میں تو اسے حدیث ہی سے ثابت کیجئے۔

اجی جناب! آپ حدیث کی تعریف تو حدیث سے کر ہی نہیں سکتے پھر ان قیاسی مسائل کی صراحت اس میں کہاں پائیں گے۔ بس سمجھ میں آیا کہ یہی سے کام مجتہد کا شروع ہوتا ہے۔ مناسب یہ ہو گا کہ جواز اجتہاد سے متعلق ایک حدیث کا مفہوم نقل کر دیا جائے۔

آقائے کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل کو یمن کا گورنر مقرر فرمایا۔ جب یمن کے لئے روانہ فرمانے لگے تو معاذ سے ایک سوال کیا معاذ تم ایک بڑے عہدہ پر جا رہے ہو۔ لوگ تمہارے پاس اپنے اپنے مقدمات لائیں گے۔ لہذا تم اس کا فیصلہ کیسے کرو گے؟ معاذ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم اس کا فیصلہ قرآن سے کریں گے۔ سرکار نے فرمایا اے معاذ! اگر تم نے اس کا جواب قرآن میں نہ پایا تو کیا کرو گے معاذ نے عرض کیا سرکار پھر ہم آپ کی حدیث دیکھیں گے اور اس سے فیصلہ کریں گے۔

آقائے کائنات نے ارشاد فرمایا اگر تم نے اس میں بھی نہ پایا تو کیا کرو گے عرض کیا اجتہاد بے بائی، قرآن و حدیث کی روشنی میں اس سے استنباط و استخراج کی کوشش کروں گا۔ اجتہاد کی صراحت نے واضح کر دیا کہ میں اجتہاد کروں گا۔

سرکار نے اس جواب پر معاذ کو زجر و توبیخ نہیں فرمائی بلکہ انتہائی مسرت سے ان کی پشت پر تحسین و مرحبا فرماتے ہوئے اپنا دست کرم رکھ دیا اور فرمایا کہ خدا کا شکر ہے کہ اس نے اپنے رسول کے رسول کو توفیق عطا فرمائی۔ اگر اجتہاد جرم و خطا ہوتا۔ ناپسندیدہ، ناقابل قبول ہوتا تو سرکار اس پر نیکمر فرماتے، اسے رد فرمادیتے اور فرماتے کہ حیرت ہے کہ قرآن و حدیث کے ہوتے تم اپنی رائے سے فیصلہ کرو گے۔ لیکن سرکار نے بجائے ناخوش ہونے کے اپنی رضا مندی کی سند عطا فرمادی۔ اس لفظ 'اجتہاد'

سے "اجتہاد" کا دروازہ کھل گیا ہے۔ کیا تعجب کہ اس کا ماخذ بھی یہی ہو۔

جب بات آہی گئی ہے تو اس حدیث مبارکہ سے ایک نکتہ کی طرف اشارہ کرتا ہوا چلوں۔ سرکار نے معاذ سے فرمایا تم فیصلہ کیسے کرو گے؟ حضرت معاذ نے عرض کیا یا رسول اللہ قرآن مجید سے۔ تو سرکار نے فرمایا کہ اے معاذ اگر قرآن میں نہ پاؤ گے تو کیا کرو گے۔

میں سے معلوم ہوا کہ قرآن میں ہونا اور ہے۔ ہمارا نہ پانا اور ہے۔ اس کا کھلا ہوا مفہوم یہ ہے کہ اس کا جواب قرآن میں تو ہو گا۔ اگر تم نہ پاؤ گے تو کیا کرو گے۔ ایسے ہی حدیث کے بارے میں فرمایا کہ اگر اس میں بھی نہ پاؤ گے تو کیا کرو گے یعنی یہ نہیں فرمایا کہ اگر حدیث میں نہ ہو گا تو کیا کرو گے۔ یہ فرمایا کہ نہ پاؤ گے تو کیا کرو گے۔

بات واضح ہو گئی۔ حدیث میں ہونا اور ہے اور ہمارا نہ پانا اور ہے اس کی تفصیل قرآن والی تقریر میں ملاحظہ فرمائیں۔

بہر حال! حضرت معاذ کے جواب نے متعین کر دیا کہ اجتہاد، اور قیاس درست ہے ورنہ سرکار اس کی اجازت نہ مرحمت فرماتے۔

اب آئیے ہم لوگ مل جل کر فیصلہ کریں کہ مجتہد کا کام کیا ہے۔

حضرات! یہ ریڑھ کی بات ہے۔ اگر پی لگا کر آپ نے سمجھ لیا تو بہت سے اچھے مسائل کو اسی کی روشنی میں حل کر سکیں گے۔ دیکھئے! ابھی میں نے عرض کیا تھا سودے متعلق قرآن بس یہ کہتا ہے کہ حرام الربوا یعنی لین لین میں زیادتی سود ہے۔ میرے سرکار نے اس کی تفصیل میں گہروں، جھرو، سونا، چاندی، نمک اور کھجور کا تذکرہ فرمایا۔

اب مسائل کا سوال یہ تھا کہ پھر سود کی دال، چنا، مٹر، دھان، چاول وغیرہ کا مسئلہ کیا ہو گا؟

حضرات! یہی آپ کو سمجھنا ہے کہ اب یہیں سے مجتہد کا کام شروع ہوتا

ہے۔ یعنی وہ اپنے مسائل میں جدوجہد سے علت مشترکہ تلاش کرتا ہے۔ مثلاً قرآن کہتا ہے "شراب حرام ہے۔ تو اب ایک مجتہد غور و فکر کرے گا کہ آخر شراب حرام ہونے کی علت کیا ہے۔ پہلے وہ منیٰ کو توڑے گا پھر مثبت کو اپنی گرفت میں لے گا۔ اس کو یوں سمجھئے۔ مثلاً وہ شراب کے بارے میں غور و فکر کرتا ہے کہ شراب کیا اس لئے حرام ہے کہ وہ بوتل میں بند ہے تو اب اس علت کو وہ توڑے گا۔ وہ یہ کہے گا کہ اگر شراب کی حرمت اس لئے ہے کہ بوتل میں بند ہے ایسی صورت میں جتنی چیزیں بوتل میں بند ہیں سب کو حرام ہونا چاہئے۔

معلوم ہوا کہ شراب ہونے کی علت یہ نہیں ہے۔ پھر وہ غور کرتا ہے۔ کیا شراب اس لئے حرام ہے کہ وہ رنگین ہے؟ اگر رنگین ہونا حرمت کی وجہ ہو جائے تو بوتل کی ہر رنگین شے کو حرام ہونا چاہئے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ لہذا حرمت کی وجہ رنگین ہونا نہیں ہے۔ پھر وہ غور کرتا ہے کیا اس لئے شراب حرام ہے کہ وہ مستیال ہے؟ ہینے والی ہے۔ اگرستیال اس کی علت ہو جائے، تو بوتل کی ہر ہینے والی شے کو حرام ہو جانا چاہئے مگر ایسا نہیں ہے اسی کا نام ہے پہلے منیٰ کو کاٹنا اور توڑنا یعنی جس قدر منیٰ پہلو کے گوشے نکلیں گے۔ سب سے پہلے اس کو مسترد کر دے گا۔ اب تفصیلاً غور کرتا ہے کہ بوتل میں بند ہونا حرمت کی علت نہیں۔ رنگین ہونا علت نہیں، ہستیال ہونا علت نہیں؛ تو جب سب کو توڑ دیا تو آخر میں اس کا مثبت پہلو اپنی گرفت میں لے کر کہتا ہے یہ سب کچھ نہیں بلکہ شراب کی حرمت کی علت "سکر" یعنی نشہ ہے۔

لہذا اب وہ اس پر قیاس کرتا ہے کہ جہاں جہاں نشہ پایا جائے گا۔ وہاں وہاں حرام کا حکم دیا جائے گا۔ چونکہ ضابطہ یہ ہے کہ جہاں جہاں علت پائی جائے گی وہاں وہاں معلول بھی پایا جائے گا۔ اسی کا نام ہے علت مشترکہ۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں علت مشترکہ کی تجسس و تلاش اور اس کا استخراج و استنباط یہی مجتہد کا بنیادی کام ہے۔ لہذا جب وہ کسی مخصوص صراحت

میں اسکی علت نکال لیتا ہے تو پھر اس کے حکم کو عام کر دیتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ یہ علت جہاں جہاں پائی جائے گی وہاں وہاں یہ حکم بھی پایا جائے گا۔ اگر اجتہاد کا دروازہ کھلا نہ ہوتا تو اسلامی زندگی مغلوب و معطل اور اجبرن ہو جاتی۔ یہ ائمہ مجتہدین ہی کی دین ہے کہ زندگی کے بے شمار مسائل ہزار ہا ہزار صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔

اور واضح رہے کہ یہ کام ہر مغرب و خیر و کا نہیں ہے بلکہ یہ کام ائمہ مجتہدین کا ہے جس کی نگاہ ترجمۃ القرآن سے لے کر احادیث اہل الرجال۔ عربی گرامر، معانی و بیسان، زبان کے مصطلحات، لغات و محاورات وغیرہ سب پر ہو۔ اور اجتہاد کے لئے جن اصول و ضوابط اور علوم و فنون کی ضرورت ہو اس سے اور اس کے لطافت کے ماسوا پر بھی نظر غائر اور دستگاہ کامل رکھنا ہو۔ دل خشیت الہی سے لبریز، عبادت اس کی فطرت اور تقویٰ اس کا شعار بن چکا ہو۔

اب موقع آ ہی گیا ہے تو حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ سماعت فرمائیں۔

امام احمد بن حنبل، امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے تلامذہ اور شاگردوں میں ہیں ایک بار حضرت امام احمد بن حنبل نے اپنے استاد حضرت سیدنا امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو خط بھیجا کہ میں خود آکر حاضر خدمت ہونا چاہتا ہوں۔ منظوری مل گئی اور آپ نے رخت سفر باندھا۔ ادھر خلیفہ وقت کو معلوم ہوا کہ امام احمد بن حنبل آنے والے ہیں تو خلیفہ نے امام شافعی سے درخواست کی کہ میں ان کی یزبانی کا شرف حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ امام شافعی نے اسے مسترد کر دیا۔ فرمایا "استقبالہ" نے سکے ہو۔ لیکن وہ مہمان میرے ہوں گے۔ خلیفہ نے اسی کو غنیمت جانا۔ شانہ استقبال کی تیاری کی گئی۔

امام شافعی کے گھر میں خوشیوں کے چراغ جل اٹھے۔ بچے پھولے نہ ساتے

کدیرے والد گرامی کے ارشد تلامذہ میں سے ایک بہت ہی بلند وبالا اور قد آور شخصیت آنے والی ہے۔ انگلیوں کے پوروں پر یہ دن گئے جا رہے ہیں۔ آخر وہ ساعت سعید آئی۔ مصر میں حضرت امام احمد بن حنبل کا شانہ تزک و احتشام کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا۔ بہت ہی پر تکلف و نیاز مندانہ استقبال یہ دیا گیا۔ سب کی زبان پر اہلا و سہلا مرحبا اور خوش آمدید تھا۔ اب اس کے بعد حضرت سیدنا امام احمد بن حنبل کا شانہ شافعی میں تشریف لائے۔ ہر طرف چہل پہل تھی۔ اور گھر جھین چراغاں سے معمور و منور تھا۔

آج ایک معزز مہمان کے اعزاز میں دار الخلافہ میں علماء و فضلا و مشائخ اور علماء سبھی کو دعوت طعام دی گئی ہے۔ اب وہ وقت بھی آ گیا کہ دسترخوان چن دیا گیا۔ اپنے وقت کے شیوخ، اہل علم، اہل زبان، اہل قلم، اہل ثروت و دسترخوان پر رونق افروز ہیں۔ امام شافعی کے بچوں کا دل بلیوں اچھل رہا ہے۔ آج ان کا قدم زمین پر نہیں آسمان پر ہے۔ مہمان نوازی میں مصروف ہیں۔ کوئی پانی لئے کھڑا ہے تو کوئی سالن لا رہا ہے۔ صاحب خانہ نے اجازت دی کہ بسم اللہ کیا جائے۔ مصری مہمانوں کے پر تکلف ہاتھ دسترخوان کی جانب بٹھے۔ بھری محفل میں جتنا تکلف کیا جاسکتا ہے اس سے کہیں زیادہ آج ایک معزز میزبان کے دسترخوان پر تکلف برتنا جا رہا ہے۔ لیکن امام احمد بن حنبل جن کے اعزاز میں دعوت دی گئی ہے وہ روٹیوں کے بٹے بٹے تولے لے رہے ہیں اور بڑی عجلت سے کھا رہے ہیں۔

امام شافعی کے بچوں نے جیسے ہی اس منظر کو دیکھا، شرم سے گردن جھک گئی۔ اور پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔ اب ان کے دل میں طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا ہونے لگے۔ بچے تو بہر حال بچے ہوتے ہیں انہوں نے سوچا کہ شاگرد ہونے کے ناطے شاید والد صاحب نے مبالغہ سے کام لیا ہو۔ اور ان کی عظمت و شہرت کا غلط پروپیگنڈہ کر دیا ہے۔ جو شخص آداب دسترخوان سے بھی ناواقف

امام وقت کیسے کہا جاسکتا ہے؟ آن کی آن میں ہزاروں باتیں ذہن میں گزرتی گئیں چنانچہ اب دسترخوان سمیٹ دیا گیا اور وہاں رخصت ہونے لگے لیکن امام احمد بن حنبل کی وہ بات بچوں کے دل میں گھر کر چکی تھی۔ نہ رہا گیا تو بچوں نے والد کے شکایت کی اور ان کو یاد دلایا کہ اسے والد گرامی کیا آپ نے احمد بن حنبل کو دسترخوان پر کھاتے دیکھا؟ امام شافعی نے جواب دیا ہاں دیکھا۔ بچوں نے اپنی زبان میں دریافت کیا کیا دیکھا۔ امام شافعی خاموش ہو گئے۔

بچوں نے خود ہی کہا۔ اباجان! کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ شاگرد ہونے کے ناطے بڑھا چڑھا کر غلط پروپیگنڈہ کر دیا گیا ہو؟ امام شافعی نے جواب دیا ایسا نہیں ہے۔ یہ خود اپنے زمانے کا بڑا امام ہے۔ بچوں نے کہا ایسے دل کیسے مٹنے جو آداب دسترخوان بھی نہ جانتا ہو اسے امام وقت کہا جائے۔ آخر ہمارے دوسرے بہاؤں نے کیا سوچا ہوگا؟

امام شافعی خاموش رہے۔ میزبان اور وہاں کا رشتہ بڑا نازک ہوتا ہے بھلا ایک معزز بھان سے یہ کیسے دریافت کر سکتا ہے کہ آپ نے اتنے بڑے بڑے لوٹے کیوں لئے۔ اور جلدی جلدی کھانا کیوں تناول کئے؟ مگر بچوں کا ذہن تشویش میں رہا اور ان لوگوں نے فیصلہ کیا کہ انہیں کسی دوسرے طریقے سے آزمایا جائے کہ آیا یہ واقعی امام ہیں یا نہیں؟

چنانچہ جیسے بچے ویسا امتحان! ان لوگوں نے مشترکہ طور پر طے کیا کہ جب امام احمد بن حنبل اپنی چار پائی پر لیٹ جائیں تو سر ہانے لوتے میں پانی بھر کر رکھ دیا جائے اور صبح سویرے اٹھتے ہی سب سے پہلے لوٹا دیکھا جائے کہ وہ پانی سے خالی رہتا ہے یا بھرا۔ اگر خالی ہو جائے تو ہم یہ سمجھیں گے کہ حضرت نے نماز تہجد کے لئے وضو فرمایا اور اگر بھرا رہ گیا تو ہم سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ یہ رات بھر سوتے رہے۔ اور خزانے لٹے رہے۔ نماز تہجد تک نہیں پڑھی۔ بچوں نے امام کے سر ہانے لوتے میں پانی بھر کر رکھ دیا۔ بڑی مشکل

سے نیند آئی۔ صبح اٹھتے ہی بچوں نے لوٹا دیکھنا شروع کیا تو حیرت اور زیادہ بڑھ گئی۔ شبہات یقین سے بدل گئے۔ کیا دیکھا کہ لوٹا پانی سے بھرے کا بھرا ہے۔ اس کی کوئی بوند خرچ نہیں کی گئی۔

اب بچے امام شافعی کو گھیرے ہیں کہ آبا جان! آپ صاف صاف بتائیں کہ اصل واقعہ کیا ہے۔ یہ سچ یا ایک عظیم شخصیت ہیں یا مصریوں کو دھوکہ میں رکھا گیا ہے؟ نہیں بیٹا ایسا نہیں۔ یہ امام وقت ہیں بچوں نے کہا کہ ان باتوں کو حاصل کر آئیے۔ بہر حال جہاں میزبان و مہمان میں تکلفات بہت ہوتے ہیں وہیں استاذ و شاگرد میں باپ بیٹا جیسا تعلق ہوتا ہے۔

چنانچہ استاد و شاگرد کے ملے امام نے دریافت کیا اے احمد یہ تم کو کیا ہو گیا کہ رات دسترخوان پر بیٹھے تو ”روٹی کے بڑے بڑے نوالے جلدی جلدی کھاتے رہے“ اور جب رات بچوں نے تمہارے سر اٹانے لڑے میں پانی بھر کے رکھ دیا تو تم ساری رات سوتے رہے۔ نماز تہجد تک نہیں پڑھی۔ کب سے تمہارا یہ رویہ ہو گیا ہے؟

امام حنبلی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ آواز بھرا گئی۔ نظروں سے قدموس ہوئے۔ عرض کیا حضور! یہ سچ ہے کہ میں نے روٹی کے بڑے بڑے نوالے لئے اور جلدی جلدی کھایا۔ مگر بات یہ دیکھی میں نے کہ یہ کسی دنیا دار کا دسترخوان نہیں ہے یہ وہ دسترخوان ہے جو اکل حلال کھاتا ہے اور دوسروں کو اسکی تلقین کرتا ہے۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ دسترخوان سے آسمان تک نور کا دھارا ہی دھارا ہے۔ دل میں خیال آیا کہ یہ نعمت روز بروز میری نہیں آئے گی۔ بل گئی ہے تو فائدہ اٹھالیا جائے لہذا میں جلدی جلدی کھانا نہیں کھا رہا تھا بلکہ اسی بہانے نور الہی سے اپنے دل کو معمور کر رہا تھا۔ چنانچہ اس کا اثر یہ ہوا کہ آج ساری رات سویا نہیں۔ چار پانی پر لیٹے لیٹے قرآن و سنت کی روشنی میں تقریباً تین سو سے زائد مسائل کا استخراج و استنباط کیا۔ فالحمد للہ تعالیٰ

حضرات! آپ کو دوسرا ضابطہ کیسما نہ ہے کہ جیسا دعویٰ ہو، ویسی دلیل مانگی جائے۔

مثلاً اگر کسی سے یہ کہا جائے کہ مثلث کے تینوں زاویے برابر دو زاویہ قائمہ کے ہیں۔ اور وہ یہ کہے کہ اگر قرآن میں نہ دکھلا سکے تو کم از کم کسی حدیث ہی میں دکھلا دو۔ اس کو دلیل مانگنا نہیں کہا جائے گا۔ بلکہ کھسیانی بنی کھسیانہ چے کہا جائے گا۔ یعنی یہ اصول اقلیدس کا ہے، جامیٹری کا ہے۔ لہذا اگر جامیٹری اور اقلیدس کا اصول ہے تو اسکی دلیل میں قرآن و حدیث کا مطالبہ نہ کیا جائے۔ بلکہ اقلیدس کا مطالبہ کیا جائے۔

ایسے ہی اگر یہ کہا جائے کہ عناصر میں کون و فساد ہوتا ہے تو کوئی کہے کہ قرآن، بخاری شریف میں دکھا دو۔ بخاری نہ ہی، صحاح ستہ کی کسی کتاب میں دکھاؤ۔ تو علی دنیا اسے پاگل خانہ بھولائے گی۔ کیونکہ یہ فلسفہ کا قانون ہے۔ لہذا دلیل میں فلسفہ کی کتاب کا نام لو۔ قرآن و حدیث کا نہیں۔

عربی گرامر کا قاعدہ یہ ہے کہ نکرہ جب تحت نفی واقع ہوتا ہے تو عموم کا فائدہ دیتا ہے۔ آپ مشکوٰۃ شریف سے دلیل نہ مانگو۔ بلکہ عربی گرامر سے دلیل مانگو۔ کہنا یہ ہے کہ اگر دعویٰ قرآن کا ہو تو دلیل میں قرآن کا نام لو حدیث کا دعویٰ ہو تو حدیث سے دلیل مانگو۔

اب اسے چند مثالوں سے سمجھنے کی کوشش کریں۔

(۱) حضرت مالک بن انس رضی اللہ عنہ جو اپنے وقت کے بلند پایہ محدث

گزرے ہیں جن کے بارے میں خود آقائے کائنات نے پیش گوئی فرمائی کہ میرے بعد ایک ایسا شخص ہوگا جس کے پاس لوگ دور دراز سے اونٹوں پر بیٹھ کر حدیث لینے آئیں گے۔ اسے اعلیٰ مدینہ کہا جائے گا۔ سرکار نے نام تو نہیں

یہ سنتے ہی امام شافعی کی آنکھوں میں سرت کے آنسو چھلک گئے۔ اور

بے شمار دعائیں دیں۔

یہ سنکر بچوں کے دل کا کانٹا دور ہو گیا اور عقیدت کی فراوانی میں کئی
گنا اضافہ ہو گیا۔ یہ ہیں وہ ائمہ مجتہدین جن کی تقلید کا قلابہ آج کروڑوں
مسلمانوں کے گلے میں ہے۔ ان میں ہر فرد اپنے آپ کو حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی
کہنے میں فخر محسوس کرتا ہے

حضرات! گفتگو کو طول دینا مقصود نہیں ہے چونکہ غیر مقلدین ائمہ مجتہدین
کی طرف سے عوام کو اکثر و بیشتر گمراہ کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے میں نے مناسب جانا
کہ اس مقدس گروہ کی حرمت و عظمت، اجاگر کر دی جائے۔

ہر حال میں سمجھنا یہی چاہتا تھا کہ بغیر قیاسی مسائل کے اگر قرآن و حدیث
کے بعد دروازہ اجتہاد نہ کھلا ہوا ہوتا تو آج قدم قدم پر زندگی کی راہوں میں گھٹا
ٹوپ تاریکی ہوتی۔ لہذا مجتہدین نے ایسی روشنی دیدی جو تاریکیوں میں اجالے
کا کام دے جس سے کروڑ ہا مسلمان فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ البتہ ڈیڑھ ٹھہرنا
کی سبب غیر مقلدین نے اٹھا رکھی ہے جو مٹھی بھر تعداد کی بھی حیثیت نہیں رکھتے

یہ مگر اویان حدیث کا یہی کہنا ہے کہ اس سے مراد حضرت امام مالک ہیں۔ وہ ایک روز اپنے تلامذہ کے ساتھ مدینہ کی گلی سے گزر رہے تھے۔ اچانک ایک پرانی، بوسیدہ دیوار پر نظر پڑی جو گری جا رہی تھی۔ امام مالک نے تلامذہ کو وہیں چھوڑ دیا۔ آگے بڑھ کر اس دیوار کو چومنا آنکھوں سے لگایا۔ واپس آگے شاگردوں نے پوچھا حضور! یہ دیوار کیوں چومی جا رہی تھی۔ فرمایا دیوار کہاں چوما۔ لوگوں نے عرض کیا۔ اسے سننا نہیں۔ ابھی ابھی مائے کی آنکھ سے دیکھا ہے تو فرمایا جب میں نے یہ دیکھا کہ دیوار پرانی ہے تو خیال آیا کہ ہو سکتا ہے۔ اس نے رسول کا زمانہ پایا ہو۔ اور جب زمانہ پایا ہے تو اس کا بھی امکان ہے کہ ادھر سے کبھی جان رحمت صلی اللہ علیہ وسلم گزرے بھی ہوں۔ اور ایسا بھی ہو سکتا ہے چلتے، پھرتے آقائے دو جہاں نے اس پر اپنا دست کر مہی لکھ دیا ہو۔ لہذا دیوار نہیں چومی جا رہی تھی نسبت مصطفیٰ کو پورے رہا کرتا۔

اب اگر کوئی کہے کہ اس کو قرآن و حدیث میں دکھاؤ کہ رب نے کہاں فرمایا کہ اسے چومو۔ تو اس کا صرف یہی جواب دیا جائے گا کہ ہم نے قرآن و حدیث کا دعویٰ ہی کہاں کیا ہے۔ یہ مسئلہ تو کتاب محبت کلمہ ہے۔ لہذا اسے کتاب محبت اور عشق رسول کے باب میں دیکھا جائے۔

حضرت محمود غزنوی اپنے غلام ایاز کو بہت چاہتے تھے۔ اسی توسط سے اس کے بیٹے محمد سے بیان فرماتے۔ محمود غزنوی ایاز کو اتنا چاہتے تھے کہ دوسرے درباریوں کو رشک ہونے لگا۔ اور یہ بات شدہ شدہ محمود غزنوی کے کان تک پہنچی۔ چنانچہ ایک مرتبہ محمود غزنوی نے دربار خاص طلب کیا اور شاہی خزانے کا ایک بہت ہی قیمتی پیالہ منگوایا۔ ایک درباری کو لے کر فرمایا اسے زمین پر گرا کر توڑ دو۔ درباری نے عرض کیا شہنشاہ! اس سے قیمتی پیالہ خزانہ عامرہ میں نہیں ہے۔ لہذا ایسا نہ کیا جائے۔ فرمایا دوسرے کو دیدو۔

بادشاہ نے اس سے بھی یہی فرمایا۔ دوسرے درباری نے بھی وہی جواب دیا جو پہلے
 درباری نے دیا تھا۔ فرمایا تیسرے کو دید و غرضیکہ اسی طرح یہ پیالہ ہاتھوں ہاتھ
 گھومتا رہا مگر کسی نے توڑا نہیں۔ اب یہ پیالہ ایاز کے ہاتھ میں آگیا۔ بادشاہ
 نے اس کو بھی وہی حکم دیا کہ اسے توڑ ڈالو۔ بادشاہ کا حکم پاتے ہی اس نے ہاتھ
 سے چھوڑا۔ پیالہ زمین پر گرنا۔ ایک آواز پیدا ہوئی اور پیالہ چکنا چور ہو گیا۔
 بادشاہ نے بظاہر غضبناک آنکھوں سے دیکھا اور گرجتی آواز میں کہا، ایاز
 تجھے کیا ہو گیا۔ کسی نے بھی اسے نہیں توڑا۔ اور تو نے اتنے قیمتی پیالے کو توڑ دیا
 ایاز نے ڈرتے ڈرتے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ بادشاہ عالم پناہ!
 ان لوگوں نے پیالہ تو نہیں توڑا مگر آپ کا حکم توڑ دالا صبح سے کہ میں نے پیالہ
 توڑ دیا مگر اس سے کہیں زیادہ قیمتی آپ کا حکم ہے۔ میں نے آپ کا حکم نہیں
 توڑا۔ حکم سلامت تو ایسے ہزاروں پیالے آسکتے ہیں۔

اب محمود غزنوی مسکرا اٹھا۔ اور کہا نادانو! تم لوگوں نے ایاز کا
 رنگ دروہ پ، کالا کھڑا ہونا، اور سانولاپن دیکھا۔ مگر یہ نہیں دیکھا کہ کیسا
 زیرک و دانا اور عقیدت کا پتلا ہے۔ تم نے رنگ دیکھا میں نے اس کا خمیر
 دیکھا۔

پھر حال محمود غزنوی ایاز کی وجہ سے اس کے بیٹے محمد کو بھی پیار کرنا جب
 کوئی ضرورت پڑتی تو اس کے بیٹے محمد کا نام لے کر پکارتا۔ ایک روز محمود غزنوی
 کو وضو کے پانی کی ضرورت ہوئی تو پکارا اسے ایاز کے بیٹے۔ کہیں سے ایاز
 نے سن لیا۔ دوڑا ہوا حاضر ہوا۔ بادشاہ سلامت! روزانہ تو اپنے غلام
 زادہ کا نام لے کر پکارتے تھے۔ آج کون سی خطا ہوئی کہ پیار کا وہ لب و
 لہجہ ختم ہو گیا۔ اور بجائے نام لینے کے پس ایاز کہہ کر پکارا۔

محمود غزنوی نے جواب دیا، اس سے خطا نہیں ہوئی۔ بات یہ ہے
 کہ تمہارے بیٹے کا نام محمد ہے۔ اور نام محمد بغیر وضو کے نہیں لینا۔ اب اگر کوئی

محمود غزنوی سے پوچھے کہ یہ قرآن میں کہاں ہے۔ اور کس حدیث میں ہے کہ نام محمد بغیر وضو نہ لیا جائے تو اس کا یہی جواب ہو گا۔ میں نے قرآن و حدیث کا کتب دعویٰ کیا ہے؟ یہ تو محبت رسول اور عشق مصطفیٰ کی اداس ہے۔ اسے کتاب محبت میں تلاش کرو۔ بخاری میں نہیں۔ محبت خود ایک دستور ہے عشق مستقل ایک ضابطہ ہے۔ یہ اسی قانون کی جزئیات و افراد ہیں۔

مجھے عرض کرنا یہی ہے کہ جیسا دعویٰ ہو ویسی دلیل مانگو۔

میلاد شریف، جلوس عید میلاد النبی، یہ سب ہماری محبت کی نشانیاں ہیں۔ لہذا دلیل میں قرآن و حدیث مست بولو۔ اسے کتاب عشق میں تلاش کرو۔ مگر عشق کی کتاب تو وہ اسے جس کو اس کی صلاوت و چاشنی ملی ہو۔ جو عشق سے کورا ہو اس کی ہوا تک نہ لگی ہو بھلا وہ کتاب محبت کو کیسے لے گا۔ عمار کا اچھا شعر ہے۔

محبت کو سمجھنا ہے تو ناصح خود محبت کر

کنارے سے کبھی اندازہ طوفاں نہیں ہوتا

حضرات! مقصد گفتگو یہ ہے کہ صرف دلیل کا طلب کرنا کمال نہیں

ہے بلکہ ہوشمندی و دانائی سے سوال کرنا یہ بہا داری ہے۔

رسب میں چاہتا ہوں کہ اس ضابطے کا دوسرا پیرا اگر اتنی بھی سمجھا

دیا جائے۔ پہلی بات یہ تھی کہ دلائل دو نہیں چار ہیں۔ اور دوسری بات یہ تھی کہ دلیل کا فراہم کرنا، منکر قیام کی ذمہ داری ہے۔

اب سنبھل کر بیٹھے اور اسے سماعت فرمائیے کہ میں ایسا کیوں کہ

راہوں بیبی جیسے شہر کی طویل و عریض سڑکوں سے آپ گزرے جس پر نہ جانے

کتنے چور اسے کتنے ناکے میں گئے۔ جہاں پر ٹرانک پولیس سگنل دیئے کو کھڑی

ہے۔ میں آپ سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا ہر چور اسے پر آپ پولیس

کی اجازت حاصل کر کے ہی آگے بڑھتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ چونکہ آپ جانتے ہیں کہ سڑک اسی لئے بنائی گئی ہے کہ ہر مسافر اس سے گزر جائے۔ سڑکوں میں کوئی جگہ ایسی ہوتی ہے کہ جہاں پہ تختی میونسپل بورڈ یا کارپوریشن کی طرف سے لگی رہتی ہے کہ ”ڈیجر“ خطرہ ہے۔ ادھر سے نہ گزرنے۔ کیا معلوم ہوا کہ روکنے اور منع کرنے کے لئے تختی تو لگائی گئی ہے مگر گزرنے کے لئے نہیں۔ دوسری مثال لیجئے! میں اللہ آباد کا رہنے والا ہوں۔ صوبہ کا ہائی کورٹ وہیں ہے جس کی ہیڈ عمارت سیکڑوں کروڑ پر مشتمل ہے۔ ہر کرے میں چلنے ٹک رہی ہے۔ آتے جاتے والے چلن اٹھائے آتے جاتے رہے۔ کسی بھی کمرے میں کہیں تختی نہیں لگی ہے کہ تشریف لائیے۔ مگر ان ہی کروڑوں میں بعض کمرے ایسے ہیں کہ جن کی پیشانی پر یہ لکھا ہے ”بغیر اجازت اندر آنا منع ہے“۔

کیا معلوم ہوا۔ جہاں روکنا مقصود ہوا وہاں تختی لگائی گئی۔ یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ قیام سے روکنے والے قیام نہ کرنے کے دلائل پیش کریں۔ قیام کرنے والے پر دلیل کی ذمہ داری نہیں ہے۔ اس لئے کہ رب نے میرے مصطفیٰ کے لئے فرمایا تعزیراً و توقیراً و لا۔ مصطفیٰ کی تعظیم و توقیر بجالاؤ۔

اس آیت سے مجھے قانون بل گیا ذات رسالت مآب موقر اور معظم ہے خدا ان کی توقیر و تعظیم بجالانے کا حکم دیتا ہے۔ لہذا تعظیم مصطفیٰ کے جتنے بھی افراد ہیں وہ سب اسی قانون کے پیٹ میں بیٹھے ہیں۔ توقیر و تعظیم کے جتنے بھی افراد ہیں وہ سب اسی قانون میں داخل ہیں۔ مقنن اصول کلی بنانا ہے۔ اگر قانون سخت ہو گا تو اس کو سمجھانے کے لئے دو الگ شاہیں دیدیگا تاکہ ان مثالوں کی روشنی میں وہ قانون سمجھ میں آجائے۔

مثلاً دارالعلوم مغرب نواز کے شیخ اکھدیت حضرت مولانا رحمت صاحب نے ایک جماعت کو منطقی کا سبق پڑھایا۔ اس میں انسان کی تعریف

بتائی کہ انسان جو ہر جسم، جسم نامی احساس، متحرک بالارادہ اور ناطق
کو کہتے ہیں یعنی جو ہر مو، عرض نہ ہو، جسم ہو اور وہ بھی بڑھنے والا جسم ہو، احساس
ہو، ارادہ سے حرکت کرتا ہو۔ اور معلومات کو ترتیب دے کر مچھولات کو حاصل
کرتا ہو۔

مثلاً اس نے یہ ترتیب دیا **العالم متغیر وکل متغیر حادث**
فالعالم حادث۔ یعنی عالم متغیر ہے اور ہر متغیر حادث ہے پس یہ نتیجہ نکلا کہ
عالم حادث ہے۔

اس قانون کو سمجھانے کے بعد آپ نے بطور مثال یہ کہا جیسے زید
اور بکو لڑکوں نے مثبت انداز میں سر ہلایا۔ ہاں ہم نے سمجھ لیا۔ اسی اثنا میں
خالد آگیا۔ مولانا نے کہا یہ بھی انسان ہے۔ تو ایک بنگالی طالب علم بولا اے
حضور ابھی تو آپ نے صرت زید بکو کا نام لیا تھا۔ خالد کا نام تو لیا نہیں تھا
ہم تو اسے انسان نہیں کہیں گے۔ تو مولانا نے سمجھایا کہ اے نادان! اب
اس کے معنی تو یہ ہوئے دنیا بھر کے جتنے انسان ہیں میں ایک ایک کر کے
سب کا نام لوں اور جن کا نام نہیں لوں گا تو تو اسے انسان ہی نہیں کہے گا۔
تب تو ساری عمر میری اسی مردم شناری میں گذر جائے گی۔

اچھا یہ تو بتاؤ کہ میں نے تیرا بھی نام نہیں لیا تھا۔ تو انسان ہے کہ
نہیں؟ یہاں نتیجہ یہ نکلا کہ مقنن کا کام ہے قانون بنانا۔ اور اس کے افراد
کو حسب ضرورت گھیرنا یہ ہماری ذمہ داری ہے۔

پس ایسے ہی خدا نے فرما دیا کہ میرے محبوب کی تعظیم کمالاؤ۔ اب قرآن
کی یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ اس کی تمام تفصیلات کو بتائے۔ یہ ہمارے
تمہارے سپرد ہے۔ لہذا جب ذاتِ مصطفیٰ موقرہ معظم ٹھہری، قابل تعظیم
قرار پائی۔ اور قیام میلاد میں عظمت ہی کا تو تصور ہے۔ لہذا قیام کرنے
والا دلیل نہ دے گا۔ پس اس کے لئے یہ عام قانون بہت کافی ہے۔ کہ

جناب رسالت آب موقر و معظم ہیں۔ البتہ منکر قیام دلیل لائے کہ میلاد میں قیام
کیوں نہ کیا جائے۔ یہ ذمہ داری قیام تعظیم کرنے والے کی نہیں ہے۔ بلکہ منکرین
قیام کی ہے۔

یہی میں نے کہا تھا کہ منکر دلیل لائے گا۔ چونکہ عام ضابطے پر دلیل
نہیں قائم کی جاتی۔ اگر ایسا ہو تو دور لازم آئے گا یا تسلسل۔ اور یہ دونوں،
حال ہیں۔ لہذا اسلمات پر دلیل کا طلب کرنا ان دونوں استحالوں میں سے کسی
ایک کو دعوت دینا ہے۔ اور محال کا واقع ہونا خود امر محال ہے۔

مگر یہ قوم رسول دشمنی میں اندھی ہو چکی ہے۔ اور بہت ہی ضدی
اور بہت دھرم واقع ہوئی ہے۔ اس واضح اور مکمل گفتگو کے بعد اگر کوئی
کہے کہ ہم میلاد و قیام مان لینے کو تیار ہیں مگر کوئی ہم کو قرآن میں یہ دکھائے کہ
رسول اللہ کا میلاد ذکر و اور قیام کر دے۔

جناب! اگر آپ کے اس طریقہ سوال کو مان لیا جائے اور اس طرح
کے سوالات کی گنجائش پیدا کر دی جائے تو یاد رہے کہ قرآن اصول کی کتاب
نہ رہ جائے گی۔ اور آپ کو سمجھ لینا چاہیے کہ اگر

ہر دلیل کے طلب کرنے میں اسی طرح کا سوال کو نام درست ٹھہرے تو قرآن میں
پاروں میں نہیں تیس ہزار پاروں میں بھی ہو جب بھی آپ کی نظر میں نامکمل
رہ جاتا

اس سوال کا لوگس ہونا یوں سمجھئے۔ مثلاً ایک صاحب کسی بڑی درمگاہ
سے فارغ ہو کر آئے چھوڑ کر کی نہیں سولہ گز کی پگڑی باندھ کر ایک فٹ کی نہیں
ہم ۱ ساڑھے چار فٹ کی سند لے کر آئے جبہ اتنا لمبا جوڑا کہ اس کے
دائیں بائیں گوشوں کو سنبھالنے کے لئے دو آدمیوں کی ڈیوٹی اب یہ بڑے
مولانا صاحب ایک دفعہ بازار جانے لگے۔ بوڑھی ماں نے کہا بیٹا! ایک نظر
مجھے بھی دیکھو۔ سر کا دوپٹہ ریزہ ریزہ ہو کر چھوٹا ہو گیا ہے۔ آنے لگتا تو اپنی

بڑھی ماں کے لئے ایک دوپٹہ لیتے آنا۔ بڑی درس گاہ کا پڑھا لکھا، ایسی رس گاہ جہاں رسول خدا کو بھی اردو پڑھائی جائے۔ اس نے جواب دیا۔ ایک نہیں ایک درجن لادوں گا مگر قرآن میں کہیں دکھا دو کہ جب ماں دوپٹہ لٹنگے، تو بیٹے کو لانا چاہئے۔ بولو پڑھا لکھا ہو گے یا گنوار اور جاہل۔ جاہل نہیں ابو جہل بلکہ اس سے کہیں زیادہ۔ گھاس کاٹنے، بھار چھونکنے والا اس ظالم سے پوچھو کہ پڑھنے گیا تھا یا ٹوکرا اٹھانے؟ ایسے ہی دوسرے مولانا سے ماں نے کہا بیٹا ازلہ ہو گیا ہے۔ بازار جا رہے ہو جو شانہ لیتے آنا بیٹے نے کہا جو شانہ میں تو برگ کا دُزباں، گل بنفشہ، خطی، عتاب و لایتی یہ سبھی کچھ ہیں مگر ماں قرآن میں کہاں ہے؟ ہم تو وہی کرتے ہیں جو قرآن میں دیکھتے ہیں حتیٰ کہ میلادِ قیام رسول بھی نہیں کرتے۔ چونکہ قرآن میں نہیں دیکھا۔

ماں نے کہا بیٹا پنکھا لاؤ۔ بیٹے نے کہا قرآن میں پنکھے کا تذکرہ کہاں ہے وہ مانگو جس کا ذکر قرآن میں ہو۔ ماں نے کہا بیٹا! پیاس کی شدت ہے شربتِ روح افزا لاؤ۔ کہا فوراً ہمدرد و اخوانہ اٹھالاؤں مگر یہ تو بتاؤ اس کا ذکر قرآن میں کہاں ہے؟ شربتِ روح افزا کا نسخہ قرآن میں کہاں پس اسی پر قیاس کرتے چلے جائے۔ میں یہی آپ سے عرض کر رہا تھا کہ اگر قرآن سے دلیل مانگئے گا یہی طریقہ اختیار کیا جائے تو قرآن اصول کی کتاب نہ رہ جائے بلکہ نبیوں کا ہی کھاتہ ہو کر رہ جائے۔ جس میں درعیلا چھدام سب لکھا جاتا ہے حضرات اس سلسلے میں اب میں خود آپ سے ایک سوال کرنے جارہا ہوں۔ بس آپ کا جواب، اس بوٹ کا خاتمہ کر دے گا۔ سوال سمجھ کر سنئے۔ تاکہ سمجھ کر جواب دیجئے۔ بسترِ علالت پہ ایک بڑھی ماں جو انتہائی کُرت و اضطراب میں کُرت بدل رہی ہے، جیسا کہ بن بانی محمدی تڑپے یہی اس کا حال ہے کسی کُرت چھین نہیں۔ شب گزرتی جا رہی ہے، رات ڈھلتی جا رہی ہے مگر آنکھوں سے نیند رخصت ہو چکی ہے۔ دور دور تک اس کا پتہ نہیں۔

اور سعادت مند بیٹا جو بریلی شریف کا پڑھا ہوا ہے وہ ماں کو پنکھا جھل
راہے۔ کراہتے ہوئے ماں نے بیٹے سے پانی مانگا۔ بیٹا! ایک گلاس پانی لاؤ
ملنے سے کچھ بندیں اتر جائیں شاید کہ تسلی ہو جائے۔ حکم پاتے ہی بیٹا آگے
بڑھا۔ صراحی کے قریب آیا۔ گلاس میں پانی انڈیلا۔ اور لے کر ماں کے پاس
آگیا۔ اب کیا دیکھتا ہے کہ اتنے ہی وقفہ میں ماں کو نیند آگئی ہے۔ اب
بیٹا اس سوچ میں پڑ گیا کہ ماں کو جگائے یا پانی پلائے؟ عقل نے فیصلہ کیا
کہ پانی پلانے کا بھی مقصد یہی تھا کہ ان کو سکون مل جائے اور نیند آجائے
اس کی نیند بہت قیمتی ہے بہت پیاری ہے۔ لہذا اسے جگایا نہ جلائے سوئے
دیا جائے۔

چنانچہ خوش بخت، خوش نصیب بچہ ایک ہاتھ میں گلاس لیتا ہے اور
دوسرے ہاتھ سے پنکھا جھلاتا ہے۔ وہ کہیں جاتا نہیں اس اندیشہ سے کہ کہیں مجھے
نہ پا کر ماں کا کلیجہ نہ پھٹ جائے۔ پنکھا جھل رہا ہے کچھ دیر بعد ماں نے کروٹ
لی۔ آنکھ کھل گئی۔ دیکھا بیٹا گلاس لے کر کھڑا ہے۔ ماں نے کراہتے ہوئے پوچھا
بیٹا! کیا ساری رات جاگتے ہی رہ گئے۔ سوئے نہیں؟

بیٹے نے جواب دیا آج کی رات سونے کے لئے نہیں جنت بنانے کی
رات ہے۔ میں تو ایک ہی رات جگا۔ میری خاطر تم نے تو نہ جانے کتنی راتیں قربان
کیں۔ اگر میں چور تک گیا، تو ساری رات کلیجہ سے لگائے بیٹھی رہیں۔ یہ ہی کام
ہے جس کے لئے سرکار نے فرمایا۔

جوانو! تمہاری جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔ اب سارا
مجمع جواب دینے کے لئے تیار ہو جائے۔ اب سب لوگ بتاؤ۔ اس بیٹے نے
اچھا کیا یا برا؟ کہیں شرک بدعت کا مرتکب تو نہیں ہوا؟ سنبھل کر جواب
دیجئے۔ بیک آواز اچھا کام کیا۔ اچھا کام کیا۔ کیا آپ لوگ اسے قرآن میں
دکھا سکتے ہیں؟ اچھا قرآن میں نہیں حدیث ہی میں دکھلا دیجئے۔ ایسا بھی

کیا کہ نہ تو قرآن میں ہے اور نہ ہی حدیث میں مگر پھر بھی اچھا

یہ جو بات میں نے کہی کہ بوڑھی ماں بستر علالت پر تڑپ رہی ہے۔
بیٹا، بیقرار ماں نے پانی مانگا۔ بیٹا پانی لینے گیا اور آگیا۔ ماں کو نیند آگئی۔
بیٹا پانی کا گلاس ہاتھ میں لئے پکھا جھلتا رہا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ
نہ تو کسی آیت کا ترجمہ ہے اور نہ ہی کسی حدیث کا۔ اب بھی سنبھل جائیے۔
اچھا کام ہو یا برا؟ اچھا اچھا اچھا۔

معلوم ہوا کہ اس کی صراحت، اس طرح نہ قرآن میں ہے نہ حدیث میں
مگر ماں کے بارے میں، ہم شریعت کا حکم جانتے ہیں کہ بیٹے کی ذمہ داری ہے
کہ وہ ماں کو آرام پہنچائے۔ ماں کی اطاعت کرے۔ بس یہ ہے قرآن کا کھلا ہوا
قانون۔

لہذا اب اطاعت اور آرام پہنچانے کے جتنے بھی افراد ہیں۔ وہ سب
کے سب اسی قانون میں شامل ہیں۔ قرآن یہ نہیں کہے گا کہ ماں کے لئے دے
افزائے شربت لاؤ۔ قرآن اس کا نسخہ نہیں بتلائے گا۔ قرآن یہ نہیں کہے گا۔ ماں
کے لئے پکھا لاؤ، قرآن یہ نہیں کہے گا دوپٹہ لاؤ جو شاندار لاؤ۔ بس قرآن نے
ایک عام قانون دیے دیا کہ ماں مطاع ہے۔ اور معظمہ ہے۔ اس کی اطاعت
کو۔ آرام پہنچاؤ۔ لَا تَقْلُ لِمَا آتَتْ تَحْتِیْ تَحْتِیْ تَحْتِیْ تَحْتِیْ تَحْتِیْ تَحْتِیْ
تک نہ کہو۔ اب اگر تم مومن ہو تو اس کا پتہ لگاؤ کہ ماں کا آرام
کن کن چیزوں میں ہے۔

بس ایسے ہی پروردگار نے فرمایا "وَتَعْنَسُ وَلَا تَوْقَرُ"۔
مصطفیٰ موقر اور معظم ہیں لہذا قابل تعظیم ہیں تو افراد تعظیم کی دلیل ہم کو نہ
دینی پڑے گی۔ بلکہ حوائج کا منکر ہو گا دلیل اسے لانی پڑے گی۔ چونکہ عام
قانون سے جب کوئی دفعہ مستثنیٰ کی جاتی ہے تو مستثنیٰ منہ "پر دلیل
نہیں قائم کی جاتی۔ بلکہ مستثنیٰ پر قائم کی جاتی ہے یہی میرا مدعا تھا کہ قیام کرنے

والادبیل نہ دے گا۔ بلکہ اس کا منکر دلیل لائے گا۔
 فالحمد لله علی ذالک
 طرہ لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

صحیح عقائد و درجات میں اعمال و نجات

عقیدہ و ایمان ایک ایسا مضبوط ستون ہے جس پر پورے اعمال کی عمارت قائم ہے۔ اگر عقیدے میں کسی طرح کا نقص پیدا ہوا تو عمارت اعمال ریت کی دیوار سے بھی زیادہ کمزور ثابت ہوگی۔ درستگی عقیدہ کے بغیر قبولیت عمل کا تصور ہواؤں میں محل تعمیر کرنے کے مترادف ہے چونکہ ایمان عمل پر مقدم ہے۔

گناہ شیطان کا ایک سجدہ کے نہ کرنے سے
ہزاروں برس گویا سجدے میں سر مارا تو کیسا مارا
بغیر کسی تاخیر کے ورق اٹھے اور دیدہ دل وایکجئے

پھر
پڑھے۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ وَكَفَى وَسَلَامٌ عَلَى جَيْبِ الذِّی
اصْطَفَى

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم
بسم اللہ الرحمن الرحیم

قُلْ لَا تَعْتَذِرُوا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ ایمَانِكُمْ

حضرات! آج میری تقریر کا عنوان ہے:

صحیح عقائد و مہارت نجات میں اعمال و مہارت نجات نہیں

آج کی تقریر بنیادی ذہن و فکر دینے والی ہے یہی ایک
ایسا ستون ہے جس پر اعمال و افعال کی پوری عمارت کھڑی کی جاتی
ہے۔ اگر ایمان و عقیدے سلامت تو ہر عمل صالح و سلامت
اس کا حال بقیہ اس شعر کے مطابق ہے۔

خشتِ اول جوں نہد معاً بکج

تاثریامی رود نہ دیوار کج

مجھے یہ سمجھانا ہے کہ ہماری اور آپ کی اسلامی زندگی و حصوں
میں بڑی ہوتی ہے۔ عقیدہ اور عمل۔ لہذا سب سے پہلے ایمان اور آپ

کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ان میں ایمان و عقیدہ مقدم ہے یا عمل ؟
حضرات ! میں پہیلی بچانا نہیں چاہتا۔ پہلے ہی مرحلے میں واضح
کئے دیتا ہوں کہ ان دونوں میں ایمان و عقیدہ مقدم ہے اور عمل
بعد میں۔

مثلاً ابھی ایک غیر مسلم اجلاس کے اس حاشیہ پر اعلان کرے
کہ بھائیو ! ہم برسوں اس کا ریسرچ و تحقیق کرتے رہے کہ اس روئے
زمین پر سب سے زیادہ سچا اور صحیح مذہب کون سا ہے ؟ تو اب مجھ
پر یہ حقیقت منکشف و آشکارا ہو گئی کہ اس لمبی چوڑی زمین پر
سب سے زیادہ قابل قبول اور پسندیدہ مذہب، مذہب اسلام
ہے۔ لہذا میں اب سب لوگوں کو گواہ بنا کر مسلمان ہونا چاہتا ہوں
آپ لوگ بلاتا خیر محمدی مسلمان کر لیجئے تو کیا رئیس ملت مولانا عبدالحی
صاحب رضوی یہ فرمائیں گے کہ ابھی عشا کا وقت ہے فوراً وضو
کر لے اور نماز پڑھ لے ! ہرگز نہیں۔ کیا مولانا عبدالحق صاحب
یہ فرمائیں گے کہ میں تجھے جانتا ہوں۔ بہت بڑا دولت مند ہے۔
بینک بیلنس ہے۔ لہذا زکوٰۃ ادا کرے ؟ ہرگز نہیں۔

کیا مولانا رضوی یہ فرمائیں گے کہ کچھ کا پاسپورٹ بن رہا ہے
تو فوراً پاسپورٹ بنو لے کچھ ادا کرے یا ہرگز نہیں۔ یہ فرمائیں
گے تو مالک نصاب ہے پہلے زکوٰۃ دیدے ہرگز نہیں۔

کیا معلوم ہوا یہ سب کے سب ارکان اسلام ہیں۔ ان میں
سے ابھی کسی کو بھی ادا نہ کیا جائے گا۔ پہلے ہاتھوں سے دامن مصطفیٰ
نہا جائے۔ اقرار توحید و رسالت سے پہلے دل کا زنگ دور کر لیا
جائے۔ اولاً شیعہ ایمان روشن کیا جائے پھر اس کی روشنی میں
سجدہ کیا جائے۔

یہی میرا کہنا ہے کہ اسلام میں اگر کوئی داخلہ لیتا ہے تو پہلے اس کے بافقوں میں اللہ کے رسول سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا دامن کرم دیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ان کو مانے گا تو اسلام کا ہر فرمان مانے گا۔ اور جب انہیں کو نہیں مانے گا تو ناز و روزہ، حج و زکوٰۃ کو کیا مانے گا۔ پہلے خدا کا سجدہ نہیں کرایا جاتا بلکہ دل کی دنیا کو نور مصطفیٰ سے معمور کیا جاتا ہے۔

حضرات! جب ماننے کی بات آئی ہے تو برسرِ راہ ایک بات عرض کرتا چلوں کسی بھی گفتگو سے پہلے اس کا فیصلہ کر لینا ضروری ہے کہ منصب نبوت جاننے پہچاننے کا ہے یا ماننے کا۔

حضرات! یہ حقیقت واضح رہے کہ نبی و رسول کو صرف جانا پہچانا نہیں جاتا بلکہ انہیں مانا جاتا ہے اور یہی ایمان و کفر کا حد فاصل اور نشان امتیاز ہے۔

اب اس اصول کو ایک بہت ہی مختصر بولتی مثال میں سمجھیں عید رسالت ہے۔ دو کافر سفیان اور صفوان حالت کفر میں مکہ میں کھڑے ہیں اور اپنے ماتھے کی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں کہ ایک ہرن کو بھیڑ یا شکار کی غرض سے دوڑا رہا ہے اور ہرن جان بچا کر بھاگا جا رہا ہے۔ اتنا تو آپ بھی جانتے ہوں گے کہ مکہ مکرمہ کی زمین دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے ایک کا نام محل ہے اور دوسرے کا "حرم"۔ محل مکہ مکرمہ کے اس خطہ ارض کو کہتے ہیں جہاں شکار کرنا ہرگز مستحب ہے۔ اور حرم، اس خطہ ارض کو کہتے ہیں جہاں شکار کرنا حرام ہے۔ یہ دونوں کافر سفیان اور صفوان، بھیڑ یا اور ہرن کا دوڑنا بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔ اچانک یہ دیکھا کہ جیسے ہی ہرن نے حرم میں قدم رکھا جہاں شکار حرام ہے بس ویسے ہی

بھڑیا رک گیا۔ گو یا کسی نے پاؤں میں آہنی بیڑی ڈال دی ہو۔

یہ دیکھ کر صفوان نے سفیان سے کہا مجھے بہت ہی حیرت اور تعجب ہے کہ ایک بھڑیا بھی جانتا ہے کہ کہاں شکار کرنا چاہئے اور کہاں نہیں کرنا چاہئے؟

خدا سے قادر مطلق نے بھڑیے کو قوت گویائی عطا فرمائی۔ اور اس نے پلٹ کر جواب دیا۔ اے لوگو! تمہاری حیرانی اس بات پر ہے کہ میں حل اور حرم کو پہچانتا ہوں اور میری حیرانی اس بات پر ہے کہ تم غیب بتانے والے محمد رسول اللہ کو نہیں پہچانتے؟ یہ سن کر صفوان نے سفیان سے کہا، اے سفیان کیا اب کبھی نہیں محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نبی و رسول ہونے میں شک و شبہ ہے؟ سفیان نے حالت کفر میں جواب دیا کہ اے صفوان آج نہیں آج سے بہت دنوں پہلے سے جانتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی و رسول ہیں۔

حضرات! غور فرمائیے، سفیان کہہ رہا ہے کہ میں

بہت دنوں سے جانتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی و رسول ہیں لیکن میں نے اسے اپنا نہیں سمجھا۔ نہ اسے گلے لگایا۔ نہ ہی اس کے لئے مسجد کا دروازہ کھولا۔ وہ گیا کافر کا کافر۔

معلوم ہوا کہ نبی کو محض جانا پہچانا نہیں جانا اگر محض جانتا پہچانتا کافی ہوتا تو سفیان زمرہ اسلام میں داخل ہو گیا ہوتا۔ بلکہ نبی کا منصب یہ ہے کہ اسے مانا جائے۔ جانا اور رہے ماننا اور سب ماننے کا تعلق دل اور صرف دل سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایمان کا تعلق کوہ پڑی اور عقل سے نہیں رکھا گیا عقل ماننے یا نہ ماننے دل اس کی گواہی دیدے اور شہادت ان لا الہ الا اللہ و اشہد ان محمدًا

عَبْدُكَ وَرَسُولُكَ۔ اسی لئے ایمان کہتے ہیں:
 ”تصدیق بجا جاوے بہ النبی صلی اللہ تعالیٰ
 علیہ وسلم۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
 جو کہہ لے کر آئے اس کی تصدیق کرنا اسی کا نام ایمان
 ہے۔“

ایک نکتہ :- اگر ایمان کا تعلق عقل سے ہوتا تو اس کے معنی یہ
 ہوتے کہ عقل جسے تسلیم کرتی اسی کو ہم بھی تسلیم کرتے اور عقل جسے
 رد و انکار کر دیتی تو اسے ہم بھی رد کرتے۔ تو اس کا واضح اور
 صریح مطلب یہ ہوتا کہ ہم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان نہیں لائے
 بلکہ پہلے اپنی عقل کو مانا۔ پھر ثانوی مرتبے میں عقل نے جسے مانا تب
 اسے ہم نے مانا۔ گویا اللہ اور اللہ کے رسول کو اول مرتبہ میں نہ مانا
 بلکہ ہر فرمان کو پہلے عقل کی ترازو پر تو لایا جاتا۔ اگر وہ اسے تسلیم
 کر لیتی تب تو اس پر ایمان لایا جاتا۔ اور اگر وہ نہ تسلیم کرتی تو ایمان
 نہ لایا جاتا۔

اس لئے اسلام نے اس میں عقل کو راہ نہیں دیا۔ تمہاری
 سمجھ میں آئے یا نہ آئے ایک مومن کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ
 قال اللہ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ قال رسول اللہ، رسول اللہ نے
 فرمایا۔ اللہ اور رسول اللہ کے فرمانے پر تسلیم کرنے کے لئے ہمیں
 کوئی دلیل نہیں مانی ہے۔ سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ خدا نے
 فرمایا اور مصطفیٰ نے فرمایا۔ فالحمد لله علی ذالک۔

ایک مقلد ہونے کے لحاظ سے جب ہم یہ کہتے
 دوسرا نکتہ :- ہیں کہ قول اہم کو بلا دلیل ماننا۔ اسی کو تقلید

کہتے ہیں جب امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہم بحیثیت مقلد بلا دلیل تسلیم کرتے ہیں۔ یہ یقینی رکھتے ہوئے کہ امام نے جو کچھ فرمایا ہے قرآن و سنت کی روشنی میں فرمایا ہے۔ یہ ان کی اپنی بات نہیں بلکہ قرآن و حدیث کے وہ اسرار و رموز جہاں تک مقلد کی آنکھ نہیں پہنچتی وہاں امام اور مجتہد کی آنکھ کام کرتی ہے۔ لہذا کسی بھی قیاسی مسئلہ میں ایک مقلد کے لئے یہ کھدینا بہت کافی ہے کہ قال ابو حنیفہ۔ ابو حنیفہ نے فرمایا اب اس کے بعد وہ دلیل نہیں مانگتا کہ ابو حنیفہ نے کیوں کہا، کیسے کہا۔ بھلا بتائیے جب امام ابو حنیفہ کا قول دلیل نہ جانتے ہوئے تسلیم کیا جاتا ہے اور اتنا کھدینا کافی ہے کہ یہ قول امام ابو حنیفہ کا ہے تو اللہ اور اللہ کے رسول کے فرمان اور حکم پر کیسے دلیل مانگی جاسکتی ہے۔ جب تقلید کی شان یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ کا نام لے لینا کافی ہے تو ایک مومن کے حق میں بس یہ کھدینا بہت کافی ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول نے فرمایا ہے۔

حضرات! یہ ایک ذیلی گفت گور آگئی تھی جس میں میں ابھ کر رہ گیا۔ گفتگو یہ چل رہی تھی کہ منصب نبوت جاننے کا نہیں، ماننے کا ہے لہذا اب میں مناسب سمجھتا ہوں کہ پہلے ہر ایک کی مثال ایسی دیدی جائے جس سے ماننے کی حقیقت روشن ہو جائے۔

حضرات! ایک بار آقائے دو جہاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے کسی یہودی سے ایک گھوڑا خریدا۔ معاملہ طے ہو جانے کے بعد فرمایا قیمت اگر لے جانا۔ چنانچہ جب وہ دروازہ بوی میں حاضر ہوا تو اس سے زیادہ کا مطالبہ کیا۔ جتنے میں اس نے فروخت کیا تھا۔ سرکار نے فرمایا تم نے اتنے میں نہیں بیچا بلکہ اتنے میں بیچا ہے مگر وہ ماننا نہیں تھا۔ اپنی بات پر مصر اور اڑا ہوا تھا۔ اتنے میں ایک

صحابی "خزیمہ" کھڑے ہو گئے۔ عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ جو کچھ فرمایا ہے
ہم سچ فرما رہے ہیں۔ آقاؐ نے دو جہاں سے فرمایا تم کیسے گواہی دے رہے
ہو۔ گواہ تو وہ بن سکتا تھا جو معاملے کے وقت موجود ہوتا۔

حضرات! اگر کوئی دنیا دار لیڈر و منسٹر ہوتا تو یہ سن کر اس کی
بانچیں کھل جاتیں اور ڈوبے کو تمکا سہارا سمجھ کر اسے اپنا گواہ بنالیتا
تو جناب اب تنہا میری بات نہ رہی اب تو ایک گواہ ہیں بل مچا ہے مگر
نہی لیڈر نہیں ہوتا، ہادی ہوتا ہے۔ اگر آڑے وقت اپنی ضرورتوں
کے پیش نظر وہی ایسے ہتھیار استعمال کرے تو قوم کی لٹیٹا ڈوب جائے
اس کا ہر نقش قدم پتھر کی لکیر اور تار یکوں کا اجالا ہوتا ہے۔

سرکار نے ان صحابی "خزیمہ" سے فرمایا جب تم اس وقت
موجود نہیں تھے تو کیسے گواہی دے رہے ہو عرض کیا یا رسول اللہ!
یہ صحیح ہے کہ میں اس وقت موجود نہیں تھا مگر اے میرے سرکار!
اگر ہر معاملہ میں دیکھنا اور موجود ہونا ہی ضروری ہو تو آپ نے فرمایا
"جنت" ہم دیکھے نہیں مگر ایمان لائے۔ آپ نے فرمایا "دوزخ"
ہم دیکھے نہیں مگر ایمان لائے۔ آپ نے فرمایا "مراط" دیکھے نہیں،
مگر ایمان لائے۔ آپ نے فرمایا "قیامت" ہم دیکھے نہیں مگر ایمان
لائے۔ جب بغیر دیکھے ہم جنت و دوزخ، میزان و ترازو، کوثر
و پل مراط پر ایمان لاسکتے ہیں تو بھلا ایک گھوڑے کے لین دین پر
آپ کی بات ہم کیوں نہیں مان سکتے۔ یا رسول اللہ! اب ہمارا معاملہ
آپ کے بارے میں دیکھنے پر موقوف نہیں رہ گیا۔ جب آپ پر ایمان
لائے تو آپ کی ہر بات پر ایمان لانا ہے۔

حضرات! یہے ماننے کی شان! چنانچہ آقاؐ کے کائنات
ان صحابی "خزیمہ" پر اس قدر خوش ہوئے کہ جس معاملے میں مسلمان

مرد کی گواہی ضروری ہوتی ہے۔ سرکار نے فرمایا وہاں تنہا اکیلے "خزیرہ" کی گواہی کافی ہو جائے گی۔ ان کی ایک گواہی دو گواہوں کے برابر ہوگی۔
 صَلَوةٌ وَسَلَامٌ عَلَیْكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ۔

حضرات! اب تو یہ بات آپ پر واضح ہوگئی کہ جانتا کیسا ہے اور ماننا کیسا ہے۔ اور یہیں سے یہ بھی پتہ چل گیا کہ "نبی" مجبور نہیں ہوتا بلکہ مختار ہوتا ہے۔ اگر اس کے اختیارات سے انکار کر دیا تو شریعت کی روشنی و تابناک عمارت بالکل بے رونق و بے نور ہو جائے، دن کے اجالے میں بھی انکھیاں سے کو اندھیرا ہی سمجھے۔

حضرات! یہ میرا عنوان تو نہیں ہے مگر اختیار کی بات اہی گئی ہے تو ایک واقعہ اور سماعت فرمائیں:-

ایک بار آقلے دو جہاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم رونق افروز ہیں۔ ایک صحابی سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے دربار گہر بار میں حاضر آئے اور اعتراض گناہ کرتے ہوئے اپنے گناہ کا کفار دریافت کیا۔

حضرات! ذرا غور تو فرمائیے! پندرہویں صدی اور عہد صحابہ میں کتنا فرق ہے۔ آج اگر ہم سے اور آپ سے گناہ ہوتا ہے تو ہم لوگ اپنے گناہوں پر پردہ ڈالتے ہیں۔ اور صرف چھپاتے ہی نہیں بلکہ جھوٹے گواہوں سے کورٹ میں گواہی تک دلاتے ہیں۔ خود بھی جھوٹ بولیں اور دوسروں سے بھی جھوٹ بلوائیں۔ یہ ہمارا حال ہے۔ اور صحابہ کا حال یہ تھا کہ اگر کالی کو ٹھری میں بشریت کی کوئی خطا ہو جائے تو دنیا ہی میں اس کی تہلیل و پاکیزگی چاہتے۔ تاکہ کل خدا کے حضور شرمندہ و شرمسار نہ ہونا پڑے۔ اور اس سے آخرت کی سزا و جزا کا یقین اور خشیت الہی سے دلوں کے معمور ہونے کا بخوبی انداز۔

ہو جائے۔

حضرات! وہ نور و نکہت کا زمانہ تھا آج جو ہزار ہا کتابوں کے بے شمار صفحات کے مطالعہ سے عاجل نہیں ہوتا اس سے کہیں زائد وہ جمال مصطفیٰ کے صحیفہ انور کی تلاوت سے ملتا تھا۔

حضرات! میں اختیار مصطفیٰ سے متعلق ایک گوشہ عرض کر رہا تھا کہ ایک صحابی نے سرکار کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اعتراف خطا کیا اور اپنے گناہ کا کفارہ دریافت کیا۔ سرور عالم رومی فداہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ایک غلام آزاد کرو۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ اتنی وسعت نہیں ہے۔ سرکار نے فرمایا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ عرض کیا یا رسول اللہ میں اس کا بھی اہل نہیں کہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ کھلا سکوں۔ سرکار نے ارشاد فرمایا، مسلسل ساٹھ روز سے رکھو۔ عرض کیا یا رسول اللہ اس پر بھی قدرت نہیں۔ سرکار بھی فرمایا ہے تمہے کہ اتنے میں کچھ کچھوریں خدمت میں پیش کی گئیں۔ سرکار نے فرمایا اچھا ایسا کرو۔ جاؤ ان کچھوروں کو مدینہ کی گلیوں میں مسکینوں کو تقسیم کر دو یہی تمہارے گناہ کا کفارہ ہو جائے گا۔ صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ مدینہ میں مجھ سے بڑا مسکین کون ہے؟ سب سے بڑا مسکین تو میں ہی ہوں۔ سرور عالم رومی فداہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا اچھا جاؤ ان کچھوروں کو کھلاؤ یہی تمہارے گناہ کا کفارہ ہو جائے گا۔

اب اس سے زیادہ نبی کے مختار و مجاز ہونے کی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے، کہ گناہ بھی سرزد ہوا اور منہ بھی بندھا کر آیا جائے۔ معذرت چاہتے ہوئے گزارش کروں گا کہ پھر اُسی نقطہ آغاز پر آجائے جہاں سے ہم نے رحلت سفر باندھا تھا کہ ایمان

عمل پر مقدم ہے۔ پہلے کسی کے ہاتھ میں دامن مصطفیٰ دیا جاتا ہے۔ تب اس سے نماز و روزے، حج و زکوٰۃ کا عہد و پیمان لیا جاتا ہے پہلے خدا کی بارگاہ میں پیشانی نہیں جھکوائی جاتی بلکہ دل جھکوا یا جاتا ہے جب دل مان لیتا ہے تو محبوب کی ہر سزا و اپرا سر دھننے کو جی چاہتا ہے ہر کار نے پہلے بچہ نہیں کروایا، سب سے پہلے اپنے کو منوایا ہے۔ چونکہ ہر کار خدا اور بندوں کے درمیان رابطہ اور وسیلہ ہیں۔ لہذا خدا اور اس کی وحدانیت کی سب سے بڑی دلیل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں گویا لا الہ الا اللہ ایک دعویٰ ہے۔ اور محمد رسول اللہ اس دعویٰ کی سب سے زیادہ اہم مضبوط روشن و تابناک اور ناقابل انکار دلیل ہے۔ ایسی دلیل جہاں سب گھٹنے ٹیک دیئے۔

سوال :- حضرات بہت سے لوگ یہاں ایک سوال کرتے ہیں کہ جو لوگ میلاد و سلام، نیاز و فاتحہ وغیرہ کے قائل نہیں وہ لوگ بھی تو دلیل میں قرآن ہی پیش کرتے ہیں؟

جواب :- حضرات! صرف ہاتھ میں قرآن کا لینا اور زبان کے اس کی تلاوت کرنا ہی کافی نہیں ہے۔ یہی تو ابھی میرا موضوع عمل رہا ہے، کہ جانا اور رہے ماننا اور رہے۔ یہ دنیا جاننے کی نہیں غلط کہہ ہے۔

اب آج آپ دور نہ جائیے۔ میں اس حقیقت کو سمجھانے کے لئے آپ کو دور نہ لے جاؤں گا اسی ملک کی ایک مثال دیتا ہوں۔ آپ نے پنڈت سندر دال کا نام سنا ہو گا وہ سیرت نبوی پر مسلسل گفتگوں بولتا ہے۔ سرکار کی مکی زندگی، مدنی زندگی، عیالی زندگی، اخلاق نبوت، عز و ات مصطفیٰ وغیرہ وغیرہ۔ اور انگریزی لولی

اردو نہیں بلکہ گویا کوثر و نسیم کی دھلی دھلائی صاف، سائستہ، شستہ و شگفتہ اردو جس کی ہر نوک و پٹک درست ہے اور وہ اپنے بھانڈو و بیان میں بطور حوالہ گیتا اور رامائن کے حوالے نہیں دیتا نہ اس کا کوئی اسٹلوک پیش کرتا ہے اور نہ کہیں کی چمپائی۔ بلکہ آیات قرآنی کا حوالہ دیتا ہے۔

مجھے کہنے دیجئے اگر اسلام کی نظر میں قرآن پڑھ لینا کافی ہوتا تو اسے پنڈت نہیں مولانا و علامہ کہا جاتا۔ سند رلال نہیں عبد اللہ کہا جاتا۔ مگر قرآن کے پڑھنے کے باوجود وہ رہ گیا پنڈت کابڈت اور سند رلال کا سند رلال۔ نہ اسے مسلمان کہا گیا اور نہ ہی اس کے لئے مسجد کا دروازہ کھلا۔

معلوم ہوا اس نے قرآن تو ہاتھ میں لیا مگر اس کا ہاتھ دامن مصطفیٰ سے خالی رہا۔ پہلے ہاتھوں میں قرآن نہیں لیا جاتا بلکہ اس دامن کو مضبوطی سے تھاما جاتا ہے جس دامن والے کے توسط و وسیلہ سے جس پائے کا قرآن ملے۔

یہی میرا کہنا ہے کہ قرآن و نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ سب پر مقدم ایمان ہے۔ اور ایمان کی روح و جان ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔

حضرات! ابھی تک میں اپنے عنوان کی ایک بہت ہی طویل ویسے تمہید میں ابھا ہوا ہوں، کہ ایمان عمل پر مقدم ہے۔ مضمون میرا یہ ہے کہ ”صحیح عقائد و درجہ نجات ہیں، اعمال و درجہ نجات نہیں“ چنانچہ اس سلسلہ میں، میں نے قرآن حکیم کی ایک آیت تلاوت کی ہے۔

حضرات! میں نے متعدد بار آپ کو یاد دلایا ہے کہ قرآنی آیات اور سورتوں اور ان کے ترجمے سے پیش تران کی شان نزول کا پتہ لگانا بہت ضروری ہے۔ اگر اس میں ہم ٹھوکر کھائے تو ہدایت سے قریب آنے کے بجائے گمراہی کے دلدل میں پھنس جائے گا اندیشہ و خطرہ لگا رہے گا۔ لہذا میں نے جس آیت کی تلاوت کی ہے:

لَا تَعْتَذِرُوا وَاَعْتَدْ كُفْرًا تَنْفَعُكُمْ بِهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ

اس کا مفہوم یہ ہے کہ تمہارا نہ کوئی عذر سنا جائے گا نہ یہاں قابل قبول ہوگا۔ ایمان لانے کے بعد تم کا فرسہ چکے ہو۔

اب اس کی کسی بھی تشریح سے پہلے شان نزول سماعت فرمیں ایک بار آقائے کائنات روحی فدوان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کرام کے ہمراہ کہیں سے گزر رہے تھے۔ اسی اثناء میں ایک جاں نثار صحابی نے عرض کیا: یا رسول اللہ! نہ جانے میرا اونٹ کہاں گم ہو گیا ہے۔ یہ سننے ہی سرور عالم نے فرمایا تمہارا اونٹ فلاں جھاڑی میں الجھا ہوا ہے۔ ان میں ایک ایسا بھی تھا جو کھرا نہیں کھوٹا تھا اب وقت آگیا کہ ایمان کی کسوٹی پر اسے پرکھا جائے۔ چنانچہ اس کے نہ رہا گیا وہ جھوٹا، دل کا اندھا بول پڑا۔ کیا محمد غیب بھی جانتے ہیں؟ بہت ہی حیرت و استعجاب اور تسخیر و استہزار کے لمحوں میں بولا۔ یہ سننے ہی صحابہ کرام کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں۔ تیوری

چڑھ گئی اور اونٹ کر سخت لب و لہجے میں

گر جتنی آواز میں جب صحابہ بولے تو وہ بیان بازی کرنے لگا کہ اگر نہیں بولیں گے تو راستہ کیسے کے ٹھکا۔ اس کے کہنے ہی وحی الہی اتر گئی۔

خدا نے تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:-

لَا تَعْتَذِرُوا وَاَعْتَدْ كُفْرًا تَنْفَعُكُمْ بِهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ

تمہارا کوئی عذر اور بہانہ نہیں سنا جائیگا تو ایمان لانے کے بعد کافر ہو گیا۔

حضرات! چہرے پر داڑھی ہے، پیشانی پر نشانِ سجدہ اب پر کلہ ہے، دامن لمبا بھی، بظاہر سجا پکا نمازی ہے اور ایسا نمازی کہ رسول اللہ کی اقتدار میں سجدہ گزارا۔ لیکن بظاہر ایسے فرشتہ صفت کے لئے یہاں کا دارالافتاء نہیں بلکہ اس احکم الحاکمین کا فیصلہ ناطق ہے کہ اب تو مسلمان ہی نہیں رہ گیا بلکہ کافر ہو گیا۔ چونکہ نبی کی بارگاہ کا گستاخ و بے ادب مسلمان نہیں بلکہ خارج از اسلام اور کافر ہوتا ہے۔

ایک بہت اہم سوال کا جواب۔ آج گمراہوں کی طرف سے لوگوں کو ذہن دیا جا رہا ہے کہ علماء بریلی "علمائے اہلسنت" مسلمانوں کی تکفیر کرتے ہیں۔

میں ان تالپوں، زبان درازوں، ناعاقبت اندیشوں، اور حقیقت شناسوں سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ عالم بالا میں "بریلی" کا کونسا دارالافتاء کھلا ہوا ہے؟ کیا مذکورہ آیت بھی معاذ اللہ اسی دارالافتاء کی ہے جو ایک کلہ گو داڑھی والے نمازی کی تکفیر کر رہی ہے؟ ڈھکے چھپے لفظوں یا اشارے و کنائے کے اصطلاح میں نہیں بلکہ کھلم کھلا، علی الاعلان پوری صراحت برطابیت سے خدا کا حکم نازل ہے کہ ایسا گستاخ و بے زبان مسلمان نہیں رہا بلکہ کافر ہو گیا۔

کیا یہاں بھی ضبط الحواس، مایہ نوبانی مریض یہ کہہ سکے گا کہ خدا تکفیر المسلمین کر رہا ہے؟ معاذ اللہ مسلمانوں کو کافر بنا رہا ہے

حضرات! اسے بہت ہی ہوش گوش۔ سے سماعت فرمائیے
کلنے کی بات آگئی ہے۔ میں خصوصاً توجہ کا طلب گار ہوں۔

سوال :- آج ہم پر یہ الزام لگایا جا رہا ہے کہ ہم مسلمانوں کو
معاذ اشتر کا فربناتے ہیں۔

اگر یہ سوال کسی بھی رخ اور تاویل سے درست ہو جائے تو
پھر کیلئے ہی الزام اسی تاویل کی روشنی و بنیاد پر خدا پر لگایا جاسکتا
ہے کہ معاذ اشتر اس نے مسلمان کو کافر بنایا۔ صد بار معاذ اشتر اگر
کوئی سر پھرا ایسا مان لے تو پھر چشم مارو شن و دل ماشاد۔

لو جگتی! ہم ایسا کر کے سنت الہیہ ادا کر رہے ہیں اور کون
جو سنت الہیہ سے ہم کو روکے

نکتہ :- لہذا اب میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ کافر بنانا اور کفر

کافرق ہے۔ آج علما کے اہلسنت پر یہی الزام ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں
کو کافر بناتے ہیں۔ اور ہمارا کہنا یہ ہے کہ ہم کافر بناتے ہیں۔ بلکہ اپنے
قول کفر سے جو واقعتاً کافر ہو چکے ہیں ہم قوم کو اس کے کفر پر مطلع کر
کے کافر بتاتے ہیں، بتاتے نہیں۔ اس لئے اپنے کفر کو اپنے علم

رہ دورغ، ظاہری تقویٰ و طہارت، ناشی ناز و زور و زور سے جھبا
رکھا تھا۔ اندیشہ تھا کہ اس ظاہری شکل و صورت کے فریب میں ان کی

کہیں قوم اس کا کفر قبول نہ کرے۔ اس لئے علما کے اہلسنت کی
دینی، شرعی اور مذہبی ذمہ داری تھی کہ حقیقت آشنا ہوتے ہوئے
اس سادہ قوم کو جو نا آشنا حقیقت تھی اس کو ان کے کفر
پر مطلع کر دے۔

حرف ادنیٰ کی بات تھی جسے افسانہ کر دیا
حضرت! اگر بتائے گا اپنا نار کھا جائے تو یہ الزام علمائے
اہلسنت کے سر نہیں آتا سب سے پہلے قرآن پر ہو گا کہ قرآن مسلمان
بنانے کے لئے اتر ہے یا کافر؟ اور معاذ اللہ خدا پر سوال ہو گا کہ
وہ تکفیر المسلمین کر رہا ہے۔

کلر گو ہے، نازی ہے، سب کچھ ہے مگر قرآن کہتا ہے
لَا تَعْتَذِرُوا فَعْدَاكُمْ شَتَّىٰ بَعْدَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ تَعَالَىٰ
بہانہ نہیں سنا جائے گا تو ایمان لانے کے بعد کافر ہو گیا۔

معلوم ہوا جب تک اس نے تسبیح اور استہزار نہیں کیا تھا
قرآن نے اس پر ایسا کوئی حکم نہیں لگایا۔ مگر جیسے ہی اس نے علم
مصطفیٰ سے تسبیح کیا، مذاق اڑایا، اس کا استہزار کیا، گستاخی، اور
بے ادبی کی، ایک کلمہ کی تاخیر کے بغیر جلال باری عتاب کی شکل میں نازل
ہو گیا۔ اور صاف صاف کہہ دیا کہ ظلم غیب نبی کا مذاق اڑانے والا
مسلمان نہیں بلکہ کافر ہوتا ہے۔

حضرات! آپ کو یہی کہنا پڑے گا کہ خدا نے کافر بنایا نہیں
بلکہ جو ظلم غیب کا مذاق اڑا کر کے کافر ہو چکا تھا۔ خدا نے ذوالجلال
نے اس کی پردہ پوشی نہیں فرمائی۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ جرم عام ہو جاتا
اور جن کے دلوں میں ”نبی“ کی طرف سے چور اور کھوٹ ہوتا ہے
وہ تو ہمیں کر کے اس کی غلط سلط تاویل کرنا چاہتے ہیں۔ خدا نے اس
کا دروازہ ہی بند کر دیا۔ اور صاف صاف اعلان فرما دیا کہ اس کا کوئی
بہانہ قابل قبول نہیں تو مسلمان نہیں کافر ہے۔ لہذا علمائے اہلسنت
پر کافر بنانے کا الزام ہرگز ہرگز نہیں لگایا جاسکتا۔
حضرت! غور فرمائیں اس سے مزاج کفر کا پتہ چلتا ہے کہ

وہ ظالم اپنا جرم چھپانے کے لئے کتنی بوردی اور بھڑی تادیل کرتا ہے وہ کہتا کیلے ہے "اگر نہیں بولیں گے تو راستہ کیسے کہے گا۔"

میں دریافت کرنا چاہتا ہوں اگر راستہ کٹنے کے لئے بولنا ہی ضروری تھا تو وہ سرکار کی تعریف کرتا۔ جب سرکار نے فرمایا تھا کہ تمہارے اونٹ کی نکیل جھاڑی میں الجھی ہوئی ہے تو انتہائی مسرت سے یہ کہنا چاہے تھا سبحان اللہ سبحان اللہ کیا کہنا ہمارے نبی کا۔ ایسے عالم غیب ہیں کہ ہر ڈھکی چھپی چیزوں کو ملاحظہ کرتے ہیں یہ ہماری فیروز بختی و اقبال مندی ہے کہ ہم ایسے عالم غیب نبی پر ایمان لائے ہیں جو زمین و آسمان کی ہر چھوٹی بڑی شے پر نگاہ رکھتا ہے مگر اس کا یہ کتنا بد بختانہ کردار ہے کہ خوش ہونے کے بجائے علم غیب نبی کو طعنہ دے رہا ہے۔

حضرات! برتن میں جو ہوتا ہے اس سے دبا ہر نکلتا ہے چونکہ اس ظالم کے دل میں گندگی بھری ہوئی تھی لہذا نوک زبان پر بھی وہی گندگی آگئی۔ بس ویسے ہی وحی الہی نے اس پر سپرہ بٹھا دیا کہ اسے اسلامی برادری سے نکال دیا جائے۔ اگر اس کی تادیل سن کر کہیں اسے معاف کر دیا گیا تو یہ جرم بہت عام ہو جائے گا۔ اور اندیشہ تھا کہ کہیں وقار نبوت اور ناموس رسالت ان گستاخوں کے ہاتھ بازیکہ اطفال بن کر نہ رہ جائے۔

مناسب ہو گا کہ یہیں پر امام قاضی عیاض کی ایک روح پرور ایمان افروز بات آپ کو سنادی جائے۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر اطہر پر رحمتوں کے پھول برسائے۔ آمین۔

فرماتے ہیں: اگر کسی گستاخ و دریدہ دہن نے رسول اللہ کے پہنے ہوئے جوتے کو یعنی "نعل" کے بجائے نفیل، کہد یا یعنی صیفہ

تصغیر کے ساتھ بجائے جوتا "کے جتربا" کہہ دیا جس سے جھوٹے پن کا اظہار ہے تو فرماتے ہیں "وہ مسلمان نہ رہا بلکہ کافر ہو گیا۔ چونکہ اس نے جوتے کی توہین و تنقیص کی جس نے تلوار جو ملہ ہے سید عالم روحی فداہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا۔

اور اتنے ہی پر اکتفا نہیں فرمایا۔ بلکہ فرماتے ہیں: لَا تُقْبَلُ تَوْبَتُهُ۔ اس کی توبہ تک نہیں قبول کی جائے گی۔
(اللہ اکبر! یہ ہے ایمان کی وہ حرارت و گرمی، جان نثاری و فداکاری اور قوت فیصلہ کی وہ شرعی تلوار جس کے ایک ہی وار نے ظالم کا کلیجہ چھلنی کر دیا۔

حضرات! اللہ کے رسول نے اگر کسی جوتے کو پہن لیا ہے اور اس پہنے ہوئے جوتے کی اگر کوئی توہین کر دے تو وہ مسلمان نہیں رہا پھر جو براہ راست سرکار کی ذات ہی پر حملہ کر رہا ہو تو تم خود بتاؤ کس اسفل السافلین کا ایندھن بنے گا۔ قربان ہی نہیں صد ہزار بار قربان، امام قاضی کے اس فیصلے پر کہ اب اس کی توبہ نہیں قبول کی جائے گی۔ بالکل یہ وہی انداز ہے جس طرح جلال باری نے اس گستاخ کی معذرت کا دروازہ بند کر دیا۔ یعنی گستاخی کر کے معذرت کیسی۔ اگر معذرت قبول کر لی گئی تو صراحتہ کفر بولو گے اور تا دہلا اسے صحیح و درست ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگاؤ گے۔ مناظرہ کرو گے، آنکھیں لال پیلی کر دو گے۔ لہذا اس کا موقع ہی کیوں دیا جائے۔ آج ہی کیوں نہ اس آنکھ کے ڈھیلے کو نکال کر زمین پر رکھ دیا جائے تاکہ دوسروں کے لئے

مقام عبرت بنے۔ بس اسی طرح قاضی عیاض نے بھی ایسے شاہم رسول
گستاخ اور بے ادب کی توبہ قبول نہ کئے جانے کا حکم دے کر ان
کے نابوت میں آخری کیل ٹھونکت دی تاکہ ایسا نہ ہونے پائے کہ
رات کو مے خوب سی پی صبح کو توبہ کر لی
زند کے زند ہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

پروردگارا! جب تک آسمانوں پر چاند و سورج تیرتے
رہیں، جگنو اور ستاروں کی چمک باقی رہے، کلیوں کی مسکراہٹ اور
پھولوں کا بانگین زندہ رہے، کوئل کی کو اور مہیا کی پی کی صدا میں
کانٹوں میں گونجتی رہیں، موسم کی تبدیلی اور رات و دن کی آنکھ بھولی
ہوتی رہے۔ قدسی صفات فرشتے ترے محبوب کی بارگاہ میں درود
و سلام کی ڈالی بٹھا کر کرتے رہیں۔ اس وقت تک امام قاضی عیاض
کی قبر اطر پر ترقی رحمتوں و برکتوں کی موسلا دھار بارش ہوتی رہے
آمین ثم آمین۔

اگر ان کا قدم نازل جانا تو میں اسے اپنے ہونٹوں سے چومتا
سینے پر رکھتا، اور پلوں سے لٹاتا۔ عشق رسول کے عنوان پر ایک
کتب خانہ ایک طرف اور یہ سمندر بھری عبادت ایک طرف۔
حضرات! ایک اور ابھرتے ہوئے سوال کا جواب
لاحظہ فرمائیں:-

آج جو درد و اذی سے یہ ذہن دینے کی کوشش کی جا رہی
ہے کہ "ارے بھی! کافر کو بھی کاہل نہ ہو۔"
حضرات! یہ بہت ہی زہر ملا نعرہ ہے۔ مٹھاس اور شہد کے
برقعے میں کیسا زہر ملا ہل ملا ہوا ہے۔ سمیت کی کیسی آمیزش ہے
اسے عام آنکھ نہیں پرکھ سکتی۔ بظاہر یہ نعرہ بہت ہی دلفریب

دلکش بھی ہے۔ اس کے پیچھے کوئی سطلی اور سادہ ذہن نہیں بلکہ اس کے پس پردہ بہت ہی بمبار ذہن جھانکتا رہا ہے۔ اس نے سمجھا تھا چلن کے اوٹ سے آنکھوں کی تلوار اپنا کام کر جائے تو بہتر ہے لیکن ایمان کی شمشیر براں نے ایک لمحہ کی ہمت دیے بغیر وہیں کا وہیں سر قلم کر کے زمین پر رکھ دیا۔

فائدان! تو خود ہی پہلے کافر ہو تا ہے اور دوسروں کو حکم دیتا ہے کہ کافر کو بھی کافر مت کہو۔ یعنی تو نے خود پہلے کافر کر دیا یعنی کافر ہے، کفر مت۔ جس طرح کوئی کئے کاٹنے کو بھی کافر نامت کہو یعنی ہے کانا مگر کفر مت۔ اگر ایسا ہی ہے کہ کافر کو بھی کافر نہ کہنا چاہئے تو پہلے تو کیوں اسے کافر کہہ رہا ہے۔ ایسے ہی موقع پر کہا جاتا ہے:-

ابھا ہے پاؤں یار کا زلف دراز میں

خود آپ اپنے دام میں صیاد آگیا

اسی لئے کبھی کبھار میں ایک تقریر کرتا ہوں کہ یہ بولتا ہے مگر سمجھتا نہیں

سوال اور اس کا جواب۔ مناسب ہے کہ یہیں پر ایک اور اچھے ہوئے سوال کا جواب دیدیا جائے۔

ان کا کہنا ہے کہ اگر ہمارے اکابر سے کہیں خطا ہو گئی اور کلمہ کفر صادر ہو گیا ہے تو صرف ”حفظ الایمان“ براہین قاطعہ اور کذبیر الناس کی کفری عبارات ہی نہ دیکھی جائیں بلکہ ان کی اسلامی خدمات کا بھی جائزہ لیجئے۔ آخر سن انھوں نے کتابیں لکھی ہیں قرآن کے ترجمے کئے ہیں! ایسی کتابیں جس میں مسئلہ کم اور مسائل زیادہ ہے صابون سازی کا کارخانہ اور طرح طرح کی فیکٹریوں کے گھولنے کے

کامیاب فارمولے درج ہیں بڑے بڑے مدرسے جو اسے جس میں
عام انسان ہی نہیں، نبیؐ کو بھی اُڑو پڑھائی گئی۔ ان لوگوں نے
پیری مریدی بھی کہے مسئلہ طریقت اپنے پیر سے پوچھتے تھے اور
شرعی مسئلہ خود اپنے پیر کو بتاتے تھے۔ اتنی لمبی چوڑی خدمات کے
ہوتے ہوئے بھی آپ لوگ ان کی تکفیر کرتے ہیں حالانکہ ہمارا نعرہ
تو یہ ہے کہ ”کافر کو بھی کافر نہ کہا جائے“

جواب:۔ حضرات! اس کا جواب میں خود نہ دوں گا بلکہ سوال
میرا اور جواب آپ کا۔ لیکن ایسا جواب نہ ہو ”السلام علیکم۔ جواب
لیکن توڑ رہا ہوں۔ آپ جیسے ہوشمندوں سے ہیں اس کی تو آنت ہے
ذہن کو نازہ کرنے کے لئے ایسا کہہ رہا ہوں۔

حضرات! بیچا نوٹے سال کا بوڑھا شوہر، نوٹے سال کی بیوی
بیوی۔ یہ وہ شوہر ہے جس نے زندگی بھر کما یا مگر بینک بیلنس ہو کر
کے نام، میرے جواہرات اسی کی تجوری میں، باغ و باغیچہ، آراضی و
تالاب، عرصہ کہ ہر طرح کی جائیداد پر بیوی ہی کا قبضہ۔ سورے اور
جواہرات سے لدی ہوئی بیوی اور یہ ہاتھ خالی شوہر۔ دونوں بڑھاپے
میں مٹے ہوئے ہیں۔ عہد رفتہ اور پرانی باتیں کر رہے ہیں۔ نانی پتے
کا تذکرہ تھا۔ بس اسی اثنائے گفتگو کا رخ بدل گیا اور بات کا خنجر
ہو گیا۔ شوہر نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ غصہ نہ برداشت کر سکا ایک
ای سانس میں دس پانچ طلاقیں پے درپے دیدیں۔ طلاق دینے کے
بعد غصہ نارمل ہوا، فکر دامن گیر اور آنکھیں اشکبار ہوئیں تو ڈنڈا
لے کر دارالعلوم غریب نواز مفتی شفیق احمد صاحب کے پاس حاضر ہوا
اس کے آنے سے پہلے اس کے بدخواہ مسئلہ دریافت کرنے پہنچ
چکے تھے۔ بوڑھے شوہر نے کہا حضور مفتی صاحب! مسئلہ سنئے

سے پہلے میری ایک بات سن لیجئے تب حکم صادر فرمائیے۔ بوڑھے شوہر نے کہا حضور! زندگی بھر محنت و مشقت کی، بدن کا پسینہ خون بن کر بہا یا، خدا نے بہت نوازا۔ ساری دولت اسی بوڑھی پر لٹا تا رہا آج جو کہو ہے اکی کے پاس ہے میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔ لہذا دو لفظ طلاق ہی کا نہ دیکھئے، میری محبت کا پھیلاؤ بھی تو دیکھئے۔ زر، زمین، باغیچہ، بنک بلینس، سونا چاندی، اہیرے جو اہرات، نوع بنوع زیورات غرض کہ مختلف انداز سے میں نے اس پر محبت کے پھول برسائے ہیں اس کے مقابل تو یہ غصہ چند لمحوں کا تھا۔ لہذا ہمارا ماضی بھی دیکھئے۔ صرف حال نہ دیکھئے جواب دیکھئے مگر ماضی کے تئیں میں۔

حضرات! دارالعلوم کا فتویٰ تو بعد میں پہلے مفتی صاحبان فرمائیں کہ طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟

جواب! طلاق، طلاق، طلاق معلوم ہوا آپ سبھی حضرات سن دیا مفتی بیٹھے ہوئے ہیں۔ ماشاء اللہ

پھر حال ایک شوہر نے زندگی بھر خواہ محبت کے کتنے ہی پھول برسائے ہوں مگر جیسے ہی وہ طلاق، طلاق کہے گا ویسے ہی میاں بیوی کا رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ اب نہ شوہر رہا نہ وہ بیوی۔ اب زندگی بھر کے تعلقات یکسر ختم ہو گئے۔

ٹھیک اسی طرح کسی نے زندگی بھر اسلام کی جو بھی خدمات انجام دیئے ہوں وہ اسی وقت تک قابل قبول اور لائق توجہ ہوں گی جب تک وہ بارگاہِ مصطفیٰ کا نیاز مند و عقیدت کیش رہا۔ مگر جیسے ہی وہ زمین آمیز کلمات کفر استعمال کرے گا ویسے ہی وہ دائرہ اسلام کے خارج ہو جائے گا۔ اس کو آپ یوں سمجھئے کہ مولانا

اپنے صاحبزادہ کی بارات لے کر گئے جس وقت بھی

حدود شریعت میں رہ کر اہتمام اور دھوم دھڑاکا ہو سکتا تھا وہ سب
 کچھ کیا، کھانے کا ایسا اہتمام کہ شاہی باورچیوں کو تلاش کر کے بلایا گیا
 تورمہ، سیخ کباب، شامی کباب، کوفتہ، مرغس کوفتہ، خشک، پلاؤ، بریانی
 مٹر پلاؤ، مرغ پلاؤ، شیر مال غرض کہ نوع بنوع نعمتوں سے دسترخوان
 کو چن دیا گیا۔ صاحب خانہ نے پہلے غریب نواز کا فاتحہ دلایا پھر ہمالوں
 نے خوب چٹخارہ لے کر کھایا۔ اب نکاح کا وقت آیا۔ قاضی عبدالسمیع
 صاحب کانپوری بلائے گئے۔ لڑکی سے کہا فلاں کا بیٹا فلاں نام بھوس
 مہر فاطمی ہم نے تم کو فلاں کے نکاح میں دیا تمہ نے قبول کیا۔ اس نے
 کہا "نا" پھر قاضی صاحب نے سہمے لے کر پوری کوشش کی، اپنی ساری
 منطق خرچ کر دی مگر اس نے کہا "نا" گھر، محلہ، پڑوس اپنے غیر سبھی
 اکٹھا ہو گئے پھر اس نے کہا "نا"۔

اسے قسم حضرات! اب اگر مولانا بصد ہوں کہ ہم تو بہر حال
 ہوسلے کر جائیں گے۔ بارات لانے میں بے شمار روپے خرچ ہو گئے۔
 اب وہ قبول کرے یا نہ کرے ہم تو بہر حال لے جائیں گے۔

حضرات! اب آپ فرمائیں کہ مولانا

اپنی ہوسلے جاسکے ہیں۔ ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔

واہ واہ سبھی مفتی حضرات جیسے ہوئے ہیں معلوم ہوا نکاح

کھانے پینے، پلاؤ زردہ، تورمہ قلیہ کا نام نہیں ہے، صرف ایجاب و
 قبول کا نام ہے۔ اگر مولانا

بھوکی

بارات لے کر آئے ہوتے اور ایجاب و قبول ہو جاتا تو خوشی خوشی ہو

لے کر چلے جاتے جس طرح نکاح میں دھوم دھڑاکے کا پھیلاؤ نہیں

دیکھا جاتا پس ایجاب و قبول۔ ایسے ہی علمی دگی کے لئے بعض لفظ طلاق

ٹھیک اسی طرح مومن ہوئے یا نہ ہوئے میں نماز و روزہ کا پھیلاؤ

نہیں دیکھا جاتا بس اتنا کافی ہے مصطفیٰ کا ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو یہ ساری چیزیں کام کی ہیں اور اگر سرکار کا نہیں تو ہر چیز بیکار و ناقابل قبول عنوان ہی تھا کہ صبح عقائد مدارِ نجات ہیں اعمال نہیں۔ حضرات! ضرورت ہے کہ اس مسئلہ کو دیگر مثالوں سے اور سمجھا دیا جائے۔ یہ پیچیدہ مسئلہ تو نہیں تھا مگر نادانوں نے پیچیدہ بنا دیا ہے۔

ارے صاحب! یہ لوگ نمازیں پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں، واڑھیاں رکھتے ہیں، مگر پھر بھی کافر کہا جائے۔؟ اے عصر حاضر کے فراعنہ! تم نے ان کی واڑھیاں دیکھیں، نائشی بندے دیکھے، سرکاری جج دیکھے مگر ان کے دل کا چور نہ دیکھا آؤ دربارِ فاروقی میں۔ یہ وہ واقعہ ہے جسے آپ نے بارہا علماء سے سنا ہو گا۔ جب بات آہی گئی ہے تو اختصاراً الجھ سے بھی سن لیجئے۔

ایک نام نہاد مسلمان و منافق، اور ایک یہودی کے درمیان یہ نزاع تھا کہ آج پہلے کسے پانی لینا چاہئے۔ یہودی کہتا تھا میری باری ہے اور وہ منافق کہتا تھا ہماری باری ہے۔ جب بات زیادہ بڑھی تو منافق نے کہا آپس میں لڑیں نہیں۔ زمانہ نبی کا ہے چل کر انہیں سے فیصلہ لے لیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ میں مسلمان ہوں۔ لہذا پیغمبر میرے ہی حق میں فیصلہ فرمائیں گے۔ چنانچہ یہودی نے کہا اگرچہ وہ پیغمبر نہیں مگر اس کا یقین رکھتا ہوں کہ اگر وہ نبی ہوں گے تو غلط فیصلہ نہیں کریں گے کیونکہ نبی کا فیصلہ غلط نہیں ہوتا۔ چلو چلیں۔

چنانچہ دونوں پیچھے مقدمہ سماعت فرمانے کے بعد اللہ کے رسول نے یہودی کے حق میں فیصلہ دیدیا کہ آج اس کی باری ہے۔ وہ بد باطن اپنے منصوبے کے لحاظ سے بڑا شرمسار ہوا۔ اور یہودی

سے کہنے لگا یہ اللہ کے رسول ہیں پتہ نہیں کس عالم محویت و استغراق میں تھے۔ چلو فاروق اعظم کے پاس۔ وہ بہت ہی مدبر و مفکر ہیں۔ ان کا فیصلہ حاصل کریں۔

یہودی نے کہا کہ ہم اس کا بھی یقین رکھتے ہیں کہ نبی کے صحابی بھی غلط فیصلہ نہیں دیں گے۔ لہذا ہم وہاں بھی چلے کو تیار ہیں۔ چنانچہ دونوں پہنچے۔ فاروق اعظم نے فرمایا تم دونوں کیسے آئے۔ یہ نمازی بولا ایک مقدمہ میں آپ کا فیصلہ چاہتے ہیں۔ فاروق اعظم کا تہور بدل نچا زمانہ رسول اللہ کا ہے اور فیصلہ لینے میرے پاس آیا ہے۔

وَلَا تَكُن مِّنَ الْكَافِرِينَ۔ خدا نخواستہ اگر نفس موٹا ہوتا تو خیال فرماتے اب میں بھی اس قابل ہو گیا کہ لوگ مجھ سے فیصلہ لینے آئے لگے۔ مگر فیضان نبوت سے نفس پائمال ہو چکا تھا تو نمازی بولا ان کا فیصلہ تو لے چکے۔ بس یہ سننا تھا کہ بہت کچھ سمجھ گئے اچھا ابھی فیصلہ کئے دیتا ہوں۔ اندر گئے تلوار میان سے باہر نکالی اور ایک وار میں اس نمازی کا سر قلم کر دیا۔ سر اُدھر گرا۔ دھڑا دھڑکا دیا۔ دیانت کا گلامت گھوٹا، انکشاف کا خون مت کر دیا، پچ بتاؤ۔ آخر میں اس نمازی نے کیا کیا تھا۔ یہی تو کہا تھا کہ نبی کا فیصلہ لے چکے لیکن فاروق اعظم نے سر کو تن سے جدا کر دیا۔ ڈانٹا پھٹکا رہا نہیں۔ دو چار طائغے نہیں مارے۔ دس پانچ دُرسے نہیں لگائے۔ بلکہ ایمان کی بھرپور توانائیوں سے آگے بڑھ کر خاک و خون میں اسے لت پت کر دیا۔ سر کہیں دھڑ کہیں۔ آخر مجھے بتائیے کہ یہ سچا بکا نمازی فاروق اعظم کی نظر میں قابل گردن زدنی کیوں ہو گیا؟

مختصر حقاقت! بات اتنی سی ہے جب اس کلمہ گو نمازی نے یہ کہا کہ میں نے پیغمبر اسلام کا فیصلہ لے لیا تو فاروق اعظم تائب ہوئے کہ ہونہ ہو

یہ رسول اللہ کے فیصلے سے راضی نہیں ہے۔ اگر راضی ہوتا تو میرے پاس کیوں آتا؟ آپ نے دیکھا جبلت فاروقی کو کہ اس حال میں اسے زندہ چھوڑ دیا گیا تو اس کے جیسے نہ جانے کتنے موسمی بینڈک اور برساتی کھڑے پیدا ہو جائیں گے جو حشرات الارض کی طرح زمین پر پھیل کر نماز و روزے کی نالاش میں اپنی عیاری و مکاری کا جال پھیلا جائے اور مدرسہ و کتابوں کے نام پر دکانیں سبائیں گے۔

لہذا اگر بہشتی روضہ اول "پر عمل کرتے ہوئے فاروق اعظم نے سری قتل کر دیا۔ تاکہ اسلامی معاشرے میں ایسے نجس و ناپاک شخص کا وجود ہی نہ رہ جائے۔

اور آگے بڑھے شدہ شدہ یہ خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کانوں تک گئی۔ اسلام کا ابتدائی دور تھا۔ چنانچہ آقائے کائنات نے فاروق اعظم سے فرمایا، عمر تم نے یہ کیا کیا؟ کہیں لوگوں میں یہ افواہ نہ پھیل جائے کہ مسلمان ہی مسلمان کا قتل ہو رہا ہے۔ عمر کی نظر میں قدم بوس ہوئیں۔ عرض کیا یا رسول اللہ! اگر میں اسے مسلمان ہی سمجھتا تو اس کا قاتل کیوں ہوتا۔ اس کی گرد راہ کو آنکھوں سے لگا لیتا۔ فاروق اعظم کا یہ عرض کرنا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ پر راضی نہ ہو وہ مسلمان ہی کہاں رہا۔

چنانچہ شعیب اسی وقت ان ہی الفاظ میں وحی الہی آنے لگی۔

جبریل امین حاضر دربار ہوئے عرض کیا:

فَلَا دَرَبَ لَكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى تُمَكِّنُوا لَهُ فِيمَا
شَخَّرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا
مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝

تو اے محبوب! تمہارے رب کی قسم وہ مسلمان نہ ہوں گے جب تک

تک اپنے آپس کے جھگڑے میں تمہیں حاکم نہ بنائیں۔ پھر جو کچھ تم حکم فرما
اپنے دلوں میں اس سے رکاوٹ نہ پائیں اور جی سے مان لیں۔

آج کا دارالافتاء تو ان شائمان رسول پر محض حکم شرعی لگاتا ہے
اگر عہد فاروقی ہوتا تو پہلے دُڑوں سے ان کی برہنہ پشت پر ضرب کاری
لگائی جاتی پھر انہیں کیفر کو دار تک پہنچا دیا جاتا۔

وہ تو رحمت تمام ہیں کہ ان دریدہ دہنوں کی زبانیں سلامت
ہیں اگر کہیں جلال موسوی ہوتا تو زبانیں کٹ کر گر گئی ہوتیں۔ اور عہد
فاروقی ہوتا تو راکھ لگا کر ان کی زبانیں گدی سے کھینچ لی گئی ہوتیں۔
بھائیو! انصاف کا خون مت کرو۔

اسی لئے میں کبھی کبھی تقریر میں عرض کیا کرتا ہوں کہ ایمان کا
رشتہ خون پر غالب آجاتا ہے۔ چنانچہ تاریخ کا ایک واقعہ سماعت
فرمائیں:-

ایک دن عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما اپنے والد محترم
سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ بیٹھے ہوئے
تھے۔ تو والد کا موڈ اچھا دیکھ کر عرض کیا کہ اگر اجازت ہو تو میں اپنے
دور جاہلیت کی ایک بات گوش گزار کروں۔ والد نے اجازت دی
ہاں کہو۔ بیٹے نے کہا: والد محترم وہ جنگ آپ کو یاد ہوگی جب کہ
آپ مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے۔ اور میں کفر کی گندگیوں میں پڑا ہوا
تھا۔ ایک جنگ میں آپ شکر اسلام کے ساتھ تھے اور میں کافروں
کے دستے میں تھا۔ گھسان کی لڑائی ہو رہی تھی کہ اچانک میری نظر ایک
آنے والے پر پڑی جو شکل و شبہات میں مسلمان تھا۔ چنانچہ اپنی
تلوار کو سونٹ کر تیار ہو گیا کہ زد میں آئے ہی گردن کاٹ کر انک
کو دوں گا۔ مگر جب آئے والا قریب آیا تو میں نے یہ دیکھا کہ کوئی

اور نہیں وہ آپ تھے۔ خون کا رشتہ غالب آیا۔ باپ سمجھ کر میں نے
 چھوڑ دیا۔ یہ سنتے ہی صدیق اکبر نے فرمایا بیٹے! تمہارے تو بچے باپ
 سمجھ کر چھوڑ دیا لیکن اگر میری نظر تم پر پڑ گئی ہوتی تو میں یہ نہ دیکھتا کہ
 تو میرا بیٹا ہے دشمن رسول سمجھ کر ذبح کر دیتا قتل کر دیتا۔ وہ کفر کا
 مزاج ہے جو خون کا رشتہ دیکھتا ہے۔ اسلام کا مزاج یہ کہ پہلے
 خون کا رشتہ نہیں دیکھتا بلکہ ایمان کا رشتہ دیکھتا ہے۔

حضرات! گفتگو ختم کرتے ہوئے آخری بات آپ سے عرض
 کر کے رخصت ہونا چاہتا ہوں کہ صحیح عقائد و مہارت نجات ہیں اعمال
 نہیں۔

سن لیجئے! گفتگو ختم کرتے ہوئے آخری بات آپ سے
 عرض کر کے رخصت ہونا چاہتا ہوں اگر کسی کی عمر ننانوے برس گیارہ
 ہینہ انیس دن کی ہے۔ تو نو برس میں ایک دن باقی ہے۔ اس نے ساری
 عمر گناہ کیا، کفر بولا ہے، شرک کیا ہے، چوری کی ہے، ادا کہ ڈالا ہے
 شراب نوشی کی ہے، غرض کہ اس کی پوری عمر سرکشی، معصیت کیشی،
 میں گزری، مگر سو برس پورے ہونے میں جو ایک دن باقی رہ گیا ہے
 اسی روز اس نے رسول اللہ کا کلمہ پڑھ لیا۔ ان کے دامن کرم کو تمام
 یا، مشرت باسلام ہو گیا۔ تو آپ جانتے ہیں اب یہ ایسے ہی ہے جیسے
 ابھی ابھی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے۔ سارا گناہ اور باپ چل
 گیا۔ اس کے بعد نہ وہ ایک وقت کی ناز پڑھ سکا نہ حج کر سکا، نہ
 زکوٰۃ دے سکا، نہ روزہ رکھ سکا۔ ایمان لایا اور اس کا انتقال
 ہو گیا۔

خوب جی لگا کے سنو! یہ مومن ہو کے مرا۔ اور جنتی ہو کے
 مرا۔ یہ مومن ہے اور جنتی ہے۔ حالانکہ اس کے پاس علی صالح نہیں۔

عل کی ایک کافی کوڑی تک نہیں، نہ بچہ ہے نہ روزہ ہے نہ حج ہے نہ زکوٰۃ۔ جب فرائض نہیں تو نوافل اور سنن و مستحبات کا کیا سوال؟ مگر وہ نجات یافتہ ہے، جنتی ہے اور میری تقریر کا عنوان ہے کہ:

”صحیح عقائد مدارِ نجات ہیں اعمال نہیں؟“

اب تصویر کا دوسرا رخ ملاحظہ فرمائیں: ایک شخص کی عمر تین سو برس گیارہ مہینہ انتیس دن کی ہے ساری زندگی اللہ اللہ کرتا ہے، یادِ الہی سے کبھی غافل نہ ہوا۔ روزہ، نماز، حج و زکوٰۃ پنج وقتہ نمازوں کے علاوہ اشراق، چاشت، اذان، تہجد عرض کہ عبادت و ریاضت کا سارا سرمایہ اس کے پاس ہے لیکن وہی سو برس میں جو ایک دن باقی رہ گیا تھا اس رات اس نے ہوٹل و حواس کی درستگی میں رسول اللہ کی توہین، گستاخی اور بے ادبی کر دی اور اس کے بعد وہ مر گیا۔

اب سے سن لیجئے مسلمان نہیں کافر ہو کے مرا۔ جنتی نہیں جہنمی اور دوزخی ہے۔ گویا میرے سرکار ہی معیار میں بے شمار گناہوں کے بعد ان کا کلہ پڑھ لیا، ان کا ہو گیا تو سب گناہ دُھل گیا۔ بلا روک ٹوک سیدھے جنت چلا گیا۔

عبادات کی لمبی فہرست، اعمال کا بڑا بوجھ لیکن ان کا دامن جب چھوٹ گیا تو زندگی کا سب کیا دھرا مٹی میں مل گیا۔ اب اس میں سے کچھ کام نہیں آئے گا۔

چھٹ جائے اگر دولت کو نین تو کیا غم
چھوٹے نہ مگر ہاتھ سے دامانِ محسود

صلی اللہ علیہ وسلم

فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی کُلِّ اٰل وَاٰلٍ

اسلام میں یادوں کی اہمیت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد لله وكفى وسلام على عبائه
الذي اصطفى. قال الله تبارك وتعالى
في القرآن المجيد والفرقان الحكيم ه
وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى

حضرت! آج میری تقریر کا عنوان ہے کہ یادوں کو برقرار رکھا جائے۔ مثلاً نہ جائے ہم انسانیت و جماعت سال کے مختلف مہینوں کے مخصوص اوقات میں اپنے اسلاف و اکابر کی یادیں مناتے ہیں۔

مختصر حضرت! میں ڈھکی چھپی باتوں کے کہنے کا قائل و عادی نہیں ایسے اشارات و کنایات جو ذہنوں کو بوجھل تو بنا دیں مگر عقدہ کشائی نہ کر سکیں ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھتا ہوں۔ یہ کوئی لال بھکر کی محفل نہیں ہے جس میں پیلیاں بکھائی جائیں۔

میکدے نے تری آنکھوں سے چھپا یا جن کو
خلوت کرہ و بیاباں میں وہ اسرار میں فاش
یہاں آپ مسائل سمجھنے آئے ہیں۔ اور میں نے حتی المقدور انہیں

سمجھانے کی ذمہ داری اپنے سر لی ہے۔

لہذا میں بہت ہی واضح الفاظ میں اس کا اظہار کئے دیتا ہوں کہ ہم اہلسنت وجماعت کبھی محفل میلاد شریف منعقد کرتے ہیں۔ بارہ ربیع الاول شریف کو جلوس عید میلاد النبی نکالتے ہیں۔ گیارہ ربیع الثانی شریف کو پیران پیر دستگیر حضور سیدی سرکار غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فاتحہ دلا کر ان کی یاد مناتے ہیں چھٹی رجب شریف کو سلطان ہند خواجہ خواجگاں سیدی سرکار غریب نواز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یاد مناتے ہیں۔ دسویں محرم الحرام شریف کو نواسہ رسول سیدنا امام عالی مقام سرکار حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور چودھویں شعبان کو اللہ کے رسول کے ایک نادریدہ عاشق حضرت سیدنا اویس قرنی اور پچیس صفر کو امام اہلسنت مجدد دین و ملت سیدنا امام احمد رضا فاضل بریلوی رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کی یادیں مناتے ہیں۔ اور دسویں ذوالحجہ کو حضرت سیدنا ابراہیم خلیل، اور حضرت سیدنا اسماعیل ذبیح کی یادیں مناتے ہیں۔ صَلَوةُ اللہِ تَعَالٰی عَلَیْہِما۔

غرضیکہ سال و مہینے اچھے خاصے یادوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ لہذا آج ہم کو اور آپ کو مل جل کر یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہم لوگ وفور عقیدت اور اقرار محبت میں مبنی مانی یادیں مناتے ہیں۔ یہ اختراع محض ہے یا کوئی مفروضہ دین گڑھ تصور ہے؟ یا واقعہ اسلام اپنے ماننے والوں کو اس کی اجازت دیتا ہے کہ یادیں منائی نہ جائیں بلکہ یادیں منائی جائیں۔ اور انہیں برقرار رکھا جائے۔

حضرت! میں یقین و اعتماد کی بلند ترین چوٹی سے بیابانگ دہل اس کا اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر اسلام کا سچائی اور دیانتداری کے ساتھ عمیق و گہری نظروں سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات ثابت ہوگی کہ اسلام کھلے بندوں اس کی اجازت دیتا ہے کہ یادیں منائی نہ جائیں بلکہ منائی جائیں۔

اگر کسی آنکھ پر تعصب و تنگ نظری اور عصبیت و تنگ خیالی کی عینک لگی ہو تو اب وہ اسے اتار دے اور انتہائی اعتدال پسندی اور سنجیدہ مزاجی سے آنے والی گفتگو پر دھیان دے۔

حضرات! اس سلسلہ میں سب سے پہلے آپ کو عہد رسالت کی ایک بات یاد دلانا چاہوں۔

زمانہ آقائے کائنات کا ہے جسے خیر القرون (بہترین زمانہ) کہا جاتا ہے۔ مہینہ غیر رمضان کا ہے اور دن دوشنبہ کا۔ سید عالم روحی فداہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم روزہ سے تھے۔

اس سلسلہ میں مسلمانوں کا ایک اسلامی مزاج اور اس کی اسلامی فطرت یہ ہے کہ اگر کوئی توانا تندرست، ہٹاکٹا، کڑیل جوان، رمضان کے مہینے میں روزہ سے نہ ہو تو اس سے دریافت کیا جائیگا کہ تمہارا روزہ کیوں نہیں؟

اور ایسے ہی اگر کوئی درویش صفت غیر رمضان میں تشریف لائیں۔ آپ نے اس محترم و معزز جہان کے کھانے کا نظم کیا، ساری نعمتیں دسترخوان پر چن دیں۔ اب آپ نے عرض کیا تشریف لائیں اور کھانا تناول فرمائیں۔ جہان نے جواب دیا میں کھانا نہ کھاؤں گا۔ آپ نے حیرت زدہ ہو کر دریافت فرمایا کیا کوئی فرد گزشتہ یا کوتاہی ہو گئی ہے؟

آنے والے جہان نے جواب دیا: ایسا نہیں ہے بلکہ میں روزہ سے ہوں۔ یقیناً ایسے موقع پر آپ سوال کریں گے، یہ آج آپ کا روزہ کیسا ہے؟

معلوم ہوا مسلمانوں کا یہ اسلامی مزاج ہے کہ رمضان میں روزہ نہ رکھنا قابل تعجب اور غیر رمضان میں روزہ رکھنا باعث حیرت۔

چنانچہ جب صحابہ کرام کو معلوم ہوا کہ آقائے دو جہاں روحی فداہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم روزہ سے تھے تو انہوں نے حیرت و تعجب سے فرمایا: یہ تو بڑا عظیم الشان عمل ہے۔

تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم روزہ سے ہیں تو صحابہ کرام نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! یہ آج سرکار کا روزہ کیسا ہے؟

جواباً سرکار نے ارشاد فرمایا "یوم ولادت" آج کے دن میں پیدا کیا گیا ہوں۔ یعنی آج میرا یوم ولادت اور پیدائش کا دن ہے۔ اس سے پتہ چلا اور حقیقت منکشف ہو گئی کہ سرکار ابد قرار سے "یوم" کی قید لگا کر متنبہ فرمادیا کہ میں اپنے یوم ولادت کو مرنے نہیں دیا بلکہ روزہ رکھ کر اسے زندہ رکھا ہے۔

معلوم ہوا کہ بڑے اچھے اور تاریخی دنوں کو فراموش نہیں کیا جاتا بلکہ اسے کسی نہ کسی طرح زندہ رکھا جاتا ہے۔

ایک سوال ہاں اب کوئی دشمن رسول یہ سوال کر سکتا ہے کہ میں نے اس حد تک تسلیم کر لیا کہ تاریخی دنوں کو مٹایا نہیں جاتا بلکہ اسے برقرار رکھا جاتا ہے۔ تو پھر ایسا کیجئے کہ جس طرح رسول خدا نے روزہ رکھا۔ بارہ ربیع الاول شریف کو آپ لوگ بھی روزہ رکھا کیجئے۔ یہ گیٹ اور شامیانہ کیسا؟ رنگ برنگ کی جھنڈیاں کیسی؟ پلاؤ اور بریانی کیوں؟ آرائش و زیبائش کیسی؟ محفل میلاد اور سلام و قیام کی دھوم دھام کے کیا معنی؟ جشن چراغاں اور تقسیم تبرک کا اہتمام کیسا؟ وغیرہ وغیرہ۔ ہاں اگر یاد ہی منانا ہے تو خاموشی سے آپ لوگ بھی روزہ رکھ لیا کیجئے۔

بہت خوب! معلوم ہوا پڑھتے نہیں گئے تھے بلکہ بھاڑ "جمونکے گئے" تھے۔ جی جناب والا! کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اس طرح کے بعض واقعات ایسے ہوتے ہیں۔ اس سے اسی فعل کی تخصیص مقصود نہیں ہوتی کہ بس یہی کیا جائے بلکہ اسی سے اصول و ضابطے، آئین و دستور جنم لیتے ہیں۔ بلکہ وہی فعل مقیس علیہ بنتا ہے۔ اور دوسری چیزوں کو اسی پر قیاس کیا جاتا ہے۔

مثلاً آقائے دو جہاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے نعت گو شاعر خصوصی حضرت حسان ابن ثابت رضی اللہ عنہ ہیں جن کا معمول یہ تھا کہ خواہ وہ خود کہیں بھی رہتے مگر آنکھ ان کی ہوتی اور روئے زیبا مصطفیٰ کا، زبان ان کی ہوتی اور خطبہ رسول اللہ کا بغرضیکہ سرکار کی ایک ایک ادا کو شعر و سخن کے سانچے میں ڈھالنا اور اسی پہلے آتش محبت پر شبنم کا چھڑکاؤ کرنا ان کا دستور محبت تھا۔ دل دیراں کو محبوب کی یادوں سے آباد رکھنا، یہ ان کی زندگی کا بہت ہی حسین مشغلہ تھا۔

انہی جانا انہی مانا نہ رکھا غیر سے کام
یثیٰ الحسند میں دنیا سے سلمان گیا،

شاعر کی فطرت ہے، جب وہ نظم، غزل، نعت و قصیدہ وغیرہ کے دو چار شعر بھی کہہ لیتا ہے تو کسی ایسے باذوق و سلیم الطبع کو ڈھونڈتا ہے جس کو اپنا کلام سنا کر اس کی داد حاصل کر سکے کبھی کبھی تو یہ ذوق شاعر کو وارفتگی کی اس حد پر پہنچا دیتا ہے کہ جب وہ کسی کو نہیں پاتا تو دیوار و درہی کو سنانے لگتا ہے۔

حضرات! روزانہ تو حضرت حسان دوسروں کو تلاش کرتے تھے لیکن آج
ان کا نصیب ہمدوش ثریا ہو کر منتہائے کمال کی آخری حدوں کو چھو رہا ہے۔

آج کوئی اور نہیں، خود آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا
”حسان“ میرے متعلق جو تم نے کہا ہے، کچھ مجھے بھی تو سناؤ۔

اسے کوئی نہیں جانتا۔ کہ یہ سنتے ہی ”حضرت حسان“ پر کیا کیفیت گذر گئی
حضرات! مجھے کہہ لینے دیجئے، گویا آج عاشق کی نہیں خود عشق کی معراج ہے۔

حسین نہیں، خود حسن، مستا چاہتا ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے ایک نکتہ ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت حسان، کو یہ حکم دے کر اپنا نعتیہ کلام مجھے سناؤ۔ گویا

ایک نکتہ سرکار سے نعت لکھنے، نعت سننے اور نعت سننے کا جواز پیدا

کرنا چاہتے ہیں یعنی نعت شریف لکھی جاسکتی ہے۔ سنائی بھی جاسکتی ہے اور

سنی بھی جاسکتی ہے۔ عصر حاضر کے فراعنہ، بد بخت اور بد نصیب نعت شریف

کا نام سنکر ”منہ بسورتے“ اور ”ناک بھوں چڑھاتے ہیں“ اور ان کے

مکروہ چہرے پر ایسی بدنما گہری لکیریں پڑ جاتی ہیں۔ جس سے چہرے کا زاویہ ہٹل

جاتا ہے۔ گویا میرے سرکار کا یہ ارشاد ہایوں ان کے بد ذیہ چہرے پر عجبی

طمانجہ اور ان کی برہنہ پشت پر تازیانہ جھرت ہے۔ یہ ان کا ایسا بد بختانہ کردار

ہے کہ انسانیت ہمیشہ نفیس و کامیاب کرتی رہے گی۔

اے تو میں یہ عرض کر ڈا ہوتا تھا کہ سرکار نے فرمایا ”حسان“ مجھے میری نعت

سناؤ۔ حسان حکم چلتے ہی سزا یا ادب ہو کر کھڑے ہو گئے۔ ابھی نوک زبان

پر کوئی حرف نہ کیا تھا، اب کچھ عرض کرنا ہی چاہتے تھے کہ سید عالم صلی اللہ علیہ

وسلم نے فرمایا: حسان! رک جاؤ۔

یہ سنتے ہی ترزہ براندام ہو گئے، خاموشی اور سنائے کی فضا بند ہو گئی۔

اب سرکار نے ایک صحابی کو حکم دیا جاؤ وہ منبر لاؤ۔ حکم پاتے ہی وہ صحابی آگے بڑھے۔ کیوں نہ جاتے؟ وہ صحابی تھے۔۔۔۔۔ نہ تھے۔ اور منبر حاضر لائے۔ اب میرے سرکار نے حضرت حسان کو دوبارہ حکم دیا کہ حسان! اس منبر پر آ جاؤ اور میری نعت پڑھو۔

میں دنیا سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا وہ کلام فرش خاک پر نہ پڑھا جاسکتا تھا؟ منبر ہی کیوں منگایا گیا؟

حضرات! اس واقعہ کو پیش کر کے تقریر کو طول دینا مقصود نہیں ہے بلکہ ایک خاص نکتہ آپ کو سمجھانا چاہتا ہوں۔ یعنی منبر کو سرکارِ اہتمام کی دلیل دینا چاہتے ہیں۔ یعنی یہ کسی اور کا نہیں میرا ذکر ہے۔ لہذا میرے ذکر میں اہتمام کرنا چاہیے معلوم ہوا بولا تو منبر ہی جارہا ہے مگر اب اس سے مراد منبر ہی نہیں ہے۔ بلکہ جب میرا ذکر کیا جائے تو اس میں اہتمام کیا جائے گویا منبر کی دلالت، اہتمام پر موری ہے۔ یعنی ذکرِ مصطفیٰ علیہ التیمۃ والتنازل بالکل سادہ طریقے سے نہ کیا جائے۔ بلکہ اس میں اہتمام ہونا چاہیے۔

حضرات! اس سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ منبر سنگا کر، اہتمام کی دلیل دینی مقصود ہے۔

اور "اہتمام" ایک ایسا جامع لفظ ہے کہ اس میں تخت، کرسی، منبر چادر، فرش و فرش، شامیانہ، گیٹ، لائٹ، جھنڈیاں، اگر بتی، عطر، تبرک اور نگر یہ سب کے سب اسی میں شامل ہیں۔ گویا اہتمام کے پیٹ میں یہ سب موجود ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ایسی گہرائیوں اور بطون کو دیکھنے و سمجھنے کے لئے نورِ ایمان اور نگاہِ مومن درکار ہے۔ "پیاز" کا ایک ہی چھلکا نہیں ہوتا چھلکے پر چھلکا ہوتا ہے۔ بس ایسے ہی بہت سے مسائل کے بطون ہوتے ہیں جس میں تہ پر

تہ ہوتی ہے۔ خزینہ میں خزینہ اور گنجینے میں گنجینہ ہوتا ہے۔

اہتمام، بظاہر ایک ہلکا پھلکا سا لفظ معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے پھیلاؤ اور وسعتوں میں بے پناہ گہرائیاں ہیں۔ چنانچہ محفل میلاد شریف میں آرائش و زیبائش سے متعلق جس قدر بھی پھیلاؤ دیکھا جاتا ہے۔ وہ سب کے سب اسی لفظ "اہتمام" کی کوکھ سے جنم لے رہے ہیں۔ انھیں نہ تو کہیں اور جگہ ڈھونڈا گیا نہ اور کہیں سے لایا گیا۔

لہذا سرکار کے روزہ رکھنے کا مقصد امت کو روزہ ہی رکھوانا نہیں بلکہ سرکارِ دو شنبہ مبارک کو روزہ رکھ کر اس دن کی اہمیت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں گویا آج کے روز کوئی بھی ایسا جائز و شرعی کام کیا جائے کہ جسے لوگ دیکھ کر یہ دریا کرتے ہوں کہ کل ایسا نہیں تھا، آج ایسا کیوں ہے؟

چنانچہ عید میلاد النبی کا جلوس اور جلسہ عید میلاد النبی کے گیت، اسٹیج شامیانے، اور ڈیکوریشن وغیرہ۔ یہ اسی سوال کی علامت اور نشانی ہیں۔

انھیں سبھوں کو دیکھ کر نہ جاننے والے، جاننے والوں سے دریافت کرتے ہیں کہ آج یہ کیسا اہتمام ہو رہا ہے؟ اب ان کو جواب دیا جاتا ہے کہ آج ہی تو بغیر اسلام کی پیدائش کا دن ہے۔

دبے تم ہی بتاؤ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو دوسری قوموں کو یہ کیسے معلوم ہوتا کہ مسلمان کسی مردہ قوم کا نام ہے یا کسی زندہ قوم کا۔ اور اس سلسلہ میں ارشاد باریؐ بھی ہے **وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ** اور اپنے رب کی نعمت کا اعلان و چرچا کرو۔ سرکارِ سے بڑھ کر ہمارے لئے اور کوئی دوسری نعمت ہو سکتی ہے معلوم ہوا رب کی دی ہوئی نعمتوں کو چھپایا نہیں جاتا۔ بلکہ اس کا اعلان اور چرچا کیا جاتا ہے۔ یہ جلوس عید میلاد النبی اور جلسہ عید میلاد النبی یہ دونوں اسی تحدیثِ نعمت اور اعلانِ اظہار کے حسین مناظر و مظاہر ہیں۔ جو خوش عقیدہ

سلمانوں کے جوشِ محبت اور وفورِ عقیدت کی ایک تابناک و روشن دلیل ہیں۔ یہ ہمارا ایک جمہوری حق ہے۔ نہ تو اب سے پہلے کسی نے اس پر قدغن لگایا۔ اور نہ ہی کسی نے پہرہ بٹھایا۔ ہم اس رسمِ سعید کو مناتے چلے آ رہے ہیں اور اپنی جیساں مستعار کے آخری لمحے تک، اگر خود نہ مناسکیں گے تو کم از کم دل زندہ میں یہ آرزو ضرور چلتی رہے گی کہ حبش چراغاں کی دھوم دھام، عشق کی پروردہ آنکھیں دیکھتی رہیں۔

گو ہاتھ میں طاقت نہیں آنکھوں میں تو دم ہے

رہنے دو ابھی ساعشر دینا مرے آگے

حضرات سے! بات کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ میں عرض یہ کر رہا تھا کہ

سرکار کے روزہ رکھنے کا مقصد ہرگز ہرگز روزہ ہی رکھوانا نہیں ہے بلکہ کسی بھی شرعی وجہاً از فعل سے اس دن کی حرمت و عزت کو برقرار رکھ کر اس کا اعلان، و چرچا بھی مقصود ہے تاکہ اس دن کی یاد باقی رہ جائے۔

حضرات سے! جب حضرت حسان کا ذکر آ ہی گیا ہے تو برسبیل تذکرہ

ان کے کمالِ عشق اور بے لوث محبت کی دل جیتنے والی ادا ملاحظہ فرمائیے:-

حضرت حسان ایک مقام پر فرماتے ہیں:-

ما ان مدحت محمد ا بمقالة

لکن مدحت مقاتلة بمحمد

اے لوگو! تم کہیں یہ دھوکہ نہ کھانا کہ میری شاعری اور شعر و سخن نے

رسولِ کریم کا مقام و منصب اونچا کر دکھایا۔ معاذ اللہ! حاشا دکلا۔ ایسا

نہیں۔ میری شاعری سے ان کا مقام بلند نہیں ہوا۔ بلکہ میری شاعری میں سرکار کے

نام آ جانے کی وجہ سے میرا کلام اونچا ہو گیا۔ سبحن اللہ! سبحن اللہ!

قربان جائے! یہ تھا صحابہ کرام کا زندہ جاوید عشق و محبت اور راہ
محبت میں ایسی معتدل و محتاط روش جو کہیں اور ڈھونڈے نہ مل سکے۔

کہاں ہیں؟ آج کے نام نہاد و عویداران عشق و محبت، اور کہاں ہیں
شرک و بدعت کے گھوکھلے نعروں کے سہارے، سادہ لوح مسلمانوں کے
ایمان و اعتقاد پر دن دھاڑے ڈاکہ ڈالنے والے جو خود اپنے رسول ہی کو زبان
اردو پڑھانے کے مدعی ہیں۔

عجلت و عجلت خاک و رابا عالم پاک و
حضرات: عنوان یہ چل رہا ہے: یادوں کو مٹایا نہیں جاتا بلکہ
یادوں کو برقرار رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں تاریخ کی ایک اور سبق آموز
کڑی ملاحظہ فرمائیے!

حضرات: غزوہ احد تاریخ اسلام کا ایک بہت ہی اہم معرکہ
ہے۔ مجھے اس کی تفصیل نہیں بتانی ہے بلکہ اس کا پس منظر پیش کرنا ہے۔ فتح و
کامرانی کے بعد جب شہدائے احد کی نعشوں کی تدفین عمل میں لائی گئی۔ اس کے
ٹھیک ایک سال پورا ہونے کے بعد آقائے دو جہاں شہدائے احد کی قبروں
پر تشریف لاتے ہیں۔

اولاً تو ایک سوال یہی پیدا ہوتا ہے کہ اگر تشریف لانا ہی تھا تو ایسا
بھی ہو سکتا تھا کہ سال پورا ہونے کے دو ایک روز پہلے یا دو ایک روز بعد
تشریف لاتے۔ مگر ایسا نہیں ہے ٹھیک اس روز جس دن سال پورا ہو رہا ہے
گویا آقائے کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اس سے اپنی قوم کو یہ ذہن دینا چاہتے
ہیں کہ قبروں پر آنا بھی جائز ہے اور برسی منانا بھی درست ہے۔

یعنی اس تشریف آوری کا یہ مقصد ہے کہ اگر یہاں نہ آیا جائے تو اعلائے

کلہ سخن کی خاطر شہدائے اُحد کے ایثار و خلوص، جاں بازی و جوانمردی، حق گوئی و ایثار پسندی گویا تنہا، دھن لٹا دینے کے جو روشن نقوش ہیں اندیشہ ہے کہ کہیں وہ مٹ نہ جائیں۔ اور تاریخ کے ایسے زریں نقوش جس سے امت مسلمہ کو سبق حاصل ہو اور اندھیرے میں اجالے کا کام دیں۔ انھیں مٹایا نہیں جاتا بلکہ اگلی نسلوں کو زندہ رکھنے کی خاطر انھیں زندہ رکھا جاتا ہے۔ اور آج ہمیں آپ سے یہی عرض کرنا ہے کہ یادوں کو مٹایا نہیں جاتا بلکہ انھیں شریعت کے بتائے ہوئے طریقوں پر خوش اسلوبی سے منایا جاتا ہے۔

سید عالم روحی فداہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم شہدائے اُحد کی قبروں پر تشریف لا کر یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ یہ شہدائے اسلام جو اپنی اپنی قبروں میں میٹھی نیند سو رہے ہیں۔ ان کے ساتھ للہیت و راستبازی اور ایثار و قربانی کی ایک بہت ہی اہم تاریخ وابستہ ہے۔

لہذا انھیں کسی نہ کسی پیاسے یا دیکھا جائے۔ انھیں ہرگز نہ بھلایا جائے۔ یاد رہے کہ تاریخ ساز شخصیتوں کا مجاہدانہ کردار محض ایک مورخ کے نوکِ قلم ہی تک نہ محدود رہے۔ کہ محض کتاب کی سطروں میں انھیں پڑھا جائے بلکہ ان کے آستانوں تک اور گہم شہیداں میں پہنچ کر خون کی ایک ایک پھینٹ اور لہو کی ایک ایک بوند سے ان کی داستانِ عظمت پوچھئے! جہاں کے دیوار و در اور ذرے ذرے کہہ رہے ہوں گے

ہرگز نہ میردا آنکہ دیش زندہ شد بہ عشق

ثبت است بر جسدِ یدو عالم دوام ما

خدا نخواستہ! شرک و بدعت کے ہتھکنڈوں کے تحت اگر آستانہ جات پر آمد و رفت بند کر دی گئی تو کم تعلیم یافتہ، عظیم الفرصت اور مصروف بکار حضرات جنہیں تاریخی مطالعہ کی فرصت نہیں، جو آستانہ جات کی قدیم علامات و نشانات ہی سے ان کی تاریخ پڑھنا جانتے ہیں۔ آخر ان لوگوں میں مذہب اسلام

کے لئے اخلاص و ایثار کی اسپرٹ کہاں سے پیدا ہو سکے گی؟ ضرورت ہے ان کے مزارات پر آتے رہنے کی گویا یہ

تمازہ خواہی داشتن کو داغہائے سینه را

گاہے گاہے باز خواں این قصہ پارینہ را

خواہ ان واقعات و قصص کو تاریخی کتابوں میں پڑھئے یا آستانوں پر پہنچ کر وہاں کے دیوار و در اور بے زبان خاموش ذروں سے پوچھئے۔

بہر حال اسلام کی اہم شخصیتوں اور اسلام کے اہم واقعات کو بھلایا نہیں جاتا۔ بلکہ ان کی یادیں مناکر انھیں کیلجے سے لگایا جاتا ہے۔ اور یہی ہمارا مدعا ہے۔

البتہ یہ بات واضح رہے کہ مراسم کی ادائیگی اور یادوں کے منانے میں اسلام نے جو خطوط کھینچے ہوں۔ ان سے تجاوز نہ ہونے کی جسارت اور سعی بے جا نہ کی جائے ورنہ کہیں نہ کہیں افراط یا تفریط کا الزام آجائے گا۔ اور اسلام کسی بھی حال میں اس کی اجازت نہیں دیتا۔

حضرات! ابھی میں نے عرض کیا تھا کہ آستانہ جات کی مختلف علامات و نشانیوں میں ماضی کی ایک مستقل تاریخ پنہاں ہے۔ اسے لفظی طور پر دھندوں سے تعبیر نہ کیا جائے۔ بلکہ اگر دیدہ اعتبار ہو۔ اور شعور و آگہی نے آپ کا ساتھ نہ چھوڑا ہو تو آستانوں کی تاریخی علامات اور اس کی نشانیوں کو دیکھ دیکھ کر مشاہدے کی روشنی میں اپنے اس معاملہ کی توثیق کرتے جائیے جسے آپ نے تاریخ کی کتابوں میں پڑھا ہے۔ جب بات آہی گئی ہے تو آئیے چل پھر کریقین و عتبات کی یہ حودت حاصل کی جائے۔

دیکھئے یہ جہیر شریف میں درگاہ روڈ سید نیچے لگا ہیں اٹھائیے یہ سامنے درگاہ معلیٰ ہے جس کا یہ بلند دروازہ! آپ کو معلوم ہے یہ بلند دروازہ نظام حیدر آباد دکن کے غلامی کی نشانی ہے یہاں راجاؤں اور نوابوں سے گزارش

نہیں کی جاتی کہ آپ دروازہ بنوادیں یا آپ بارہ دری بنوائیں یا آپ گیٹ ونگر خانہ بنوادیں۔ بلکہ اپنے اپنے وقت کا سلطان و شہنشاہ خود درخواست گزارتا ہے کہ میں گیٹ بنانے یا ہمیں مسجد تعمیر کرنے کی اجازت دی جائے۔ اچھا ذرا اور آگے بڑھئے۔ یہ دیکھئے یہ جلال الدین اکبری کی چڑھائی ہوئی ڈیگ ہے جس میں بیک وقت تھو من کا تبرک تیار ہوتا ہے۔ یہ وہ دوسری ڈیگ ہے جس میں اتھی من دیا پکانی جاسکتی ہے۔

یہ داہنے بازو پر آسمان بولتا گیٹ دیکھئے، یہ اکبری گیٹ ہے۔ اور آگے بڑھئے یہ شاہجہانی مسجد ہے گویا جنت کا کوئی ٹکڑا خاک پر رکھ دیا گیا ہے یہ جھارہ ہے۔ یہ عالمگیری مسجد ہے۔ یہ اولیاء مسجد ہے۔ یہ ڈھائی دن کا جھونپڑا ہے۔ یہ وہ پتھر ہے کہ جب دشمنوں نے اوپر سے پھینکا تھا تو غریب نواز کے گھوڑے نے اپنے پاؤں سے روک دیا تھا۔ دیکھو ابھی تک اس پر گھوڑے کی ٹاپ کے نشانات ہیں۔

یہ وہ پتھر ہے جسے غریب نواز نے اپنے چابک سے روک دیا تھا۔ دیکھو ابھی تک اس پر چابک کا نشان ہے۔ ہاں ہاں یہ وہی انا سا گرہے دشمنوں نے جس کا پانی سلطان ہند پر بند کر دیا تھا۔ اور غریب نواز نے اس کا سارا پانی اپنے معتقد کے ذریعہ چھاگل میں بھر دیا تھا۔ دیکھو وہ دراڑ تیکری ہے۔ وہ تارا گڑھ ہے۔ وہ غریب نواز کا چلہ ہے۔ غرضیکہ پورا جہیز تاریخی نشانوں میں گھرا ہوا ہے۔

مجھے حیرت ہے جن واقعات کو تاریخ کے صفحے پر پڑھا جاسکتا ہے خود انہیں ماننے کی کھلی آنکھوں سے کیوں نہیں دیکھا جاسکتا؟

اتنی نہ بڑھا پائی داماں کی حکایت

دامن کو ذرا دیکھو ذرا بند تبا، دیکھ

مجھے کہنا یہ ہے کہ اگر آستانہ جات یا دیگر تاریخی مقامات کے آثار

وعلامہ مٹا دیئے جائیں تو مستقبل میں کسی بھی وقت ان واقعات کو جھٹلایا جاسکتا ہے اور ان کی تکذیب کی جاسکتی ہے۔ ایسے تاریخی دستاویز تو طلسم ہوش ربایا الف لیلیٰ کی مفروضہ داستان اور من گڑھت کہانیاں تصور کی جائیں گی۔

حضرات! دیکھئے یہ کچھ چھم مقدس ہے یہاں اللہ کا وہ محبوب بندہ آرام فرما ہے جس نے سمنان کی سلطنت اور تخت و تاج اور شاہی کروز کو پاؤں کی ٹھوکر مار کر دیشی اختیار کی اور آج کروڑوں انسانوں کے دلوں پر حکومت کر رہا ہے۔ دیکھئے یہ آستانہ کے مشرقی جانب ایک تھوڑا سا راستہ چھوڑ کر ہر طرف پانی سے گھرا ہوا ہے۔ جسے نیر کہا جاتا ہے اور پورے پانی پر "سوار" کی ہری گھاس محل کی طرح بچھی ہوئی ہے جو بطور شفاء استعمال کی جاتی ہے۔ غرضیکہ اس کے ساتھ ایک ستقل تاریخ وابستہ ہے۔

یہ بہرائچ شریف ہے جہاں سیدی سالار مسعود غازی آرام فرما ہیں۔ قدم قدم پر ماضی کی نشانیاں دیکھتے جاؤ۔ اور عہد رفتہ کی یادوں سے اپنے اسلاف کی پاکیزہ اُرداح کو بلندی درجات کی دعائیں دیتے جاؤ۔ یہ وہ آستانہ ہے جہاں مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم لاکھوں کی تعداد میں حاضر ہوتے ہیں۔ بلکہ میلہ میں کئی لاکھ غیر مسلموں ہی کی ہماہمی رہتی ہے۔

حضرات نے! جب سخن گسترانہ بات آہی گئی ہے

تو دل یہ چاہتا ہے

کہ صرف چند منٹ کے لئے اپنے معینہ عنوان سے ہٹ کر آج کے ایک ابھرے ہوئے مسئلہ کی وضاحت کر دی جائے۔ چونکہ بعض لوگوں نے آج قبر پر حاضری کو ہماری تضحیک اور اپنے مشن کی تشہیر کا ہتھکنڈا بنا رکھا ہے۔ لہذا معذرت کے ساتھ میں آپ سے عرض کروں گا کہ اس عنوان سے متعلق چند گوشے سماعت فرمائیے جب وہ فرقہ ثنائیہ "قبری کے پیچھے بڑا ہے تو ہم بھی چاہتے ہیں کہ آج اسے سیدہ قبرستان ہی تک پہنچا دیا جائے۔ جہاں سے پھر وہ واپس نہ آ سکے۔

حضرات! ان لوگوں کا کہنا ہے کہ قبر پر جانا شرک و بدعت ہے اب

اس سلسلے میں میں آپ کو ایک بات یاد دلانا چاہتا ہوں کہ "صاحب خصائص کبریٰ" حضرت جلال الدین سیوطی علیہ الرحمہ ایک واقعہ نقل فرماتے ہیں کہ:-

ایک بار آقائے کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کسی راہ سے گذر رہے تھے قریب ہی میں والدہ ماجدہ کی قبر تھی۔ سرکاسے ارادہ فرمایا کہ والدہ ماجدہ کی قبر پر حاضری دی جائے۔ جیسے ہی دل میں خیال گذرا جبریل امین حاضر دربار ہوئے عرض کیا یا رسول اللہ! اگر آپ چلنا چاہیں تو تشریف لے چلیں۔ چنانچہ والدہ کریم کی قبر پاک پر تشریف لائے۔ تشریف لانے کے بعد اپنے ہاتھوں کو جیسے ہی اٹھانا چاہا۔ جبریل پھر حاضر ہو گئے عرض کیا یا رسول اللہ! ہاتھ نہ اٹھائیے۔

اس سے ایک گمراہ اور بھی زیادہ گمراہی کے دلدل میں پھنس گیا۔ اور اس نے معاذ اللہ یہ کہنا شروع کیا کہ آپ کی والدہ قابض بخشائش تھیں ہی نہیں۔ اسلئے ہاتھ اٹھانے سے روک دیا گیا۔

گویا اس بد بخت نے اپنی ماں پر مصطفیٰ جانِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ ابویہ وسلم کی ماں کو قیاس کیا۔ جیسا کہ اصول ہے المسرء یقیس علیہ نفسہ۔ حالانکہ یہ بات نہ تھی۔

حضرت علامہ جلال الدین سیوطی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کا محبت عقیدت سے تعبیر ہوا جواب عطا فرمایا :-

فرماتے ہیں اسلام کا ابھی ابتدائی دور تھا۔ اگر سرکار کو ہاتھ اٹھانے دیا جاتا تو ہو سکتا تھا کہ دشمنان مصطفیٰ طعنہ دیتے کہ نبی کی والدہ اس وقت بخشی گئیں جب نے اپنا دست کرم اٹھایا۔ مگر قدرت کو یہ کب گوارہ ہو کہ کوئی دریدہ دہن گستاخ و بے ادب نبی کا دل دکھائے اور ان کی دل آزاری کرے۔

دوستو! بات یہ نہ تھی بلکہ اصل بات وہ ہے جسے علامہ جلال الدین سیوطی علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ اگر آج سرکار نے ہاتھ اٹھایا تو اندیشہ تھا کہ کل کہیں لوگ یہ کہنا نہ شروع کر دیں کہ نبی کی والدہ اس وقت بخشی گئیں جب نبی نے اپنا ہاتھ اٹھایا مقصد یہ ہے کہ یا رسول اللہ آپ اس کی تکلیف نہ اٹھائیں۔ آپ کا نور جن جن اصحاب و ارحام سے گذر تا گیا سب کو نور بناتا گیا۔

ایک واقعہ ایک بار ایک بھابی نے اپنی لونڈی کو حکم دیا کہ دسترخوان صاف کر ڈالو۔ چنانچہ خادمہ اسے لے کر آگ کے نور تک پہنچی اور ایک گوشہ کو اپنے ہاتھ میں لے کر باقی سب کو آگ کی بھٹی میں ڈال دیا۔ اور چند لمحے بعد اس میں سے اس بچڑے کو نکالا تو وہ دھلا دھلایا بالکل صاف شفاف نکلا آقلے خادمہ سے کہا میں نے تم کو دھونے کے لئے کہا تھا اور تو نے اس کو شعلے کی لپٹ میں ڈال دیا۔ آگ کا کام جلانا ہے۔ خادمہ نے عرض کیا۔ اتنا تو میں بھی جانتی ہوں کہ پانی کا کام دھونا اور آگ کا کام جلانا ہے۔

مگر میں نے ایک روز ایسا دیکھا تھا کہ میرے سرکار نے اسی دسترخوان سے اپنی انگلیاں صاف فرمائی تھیں تو میرا ایمان اور عقیدہ بول رہا تھا کہ جس پر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی انگلی پڑ گئی۔ اس پر آگ اثر نہیں کر سکتی۔ چنانچہ آج اس کا مشاہدہ بھی ہو گیا اور شبہات بھی رفع ہو گئے۔ یعنی دسترخوان تو نہ جلا البتہ وہ شبہات جل کر خاکستر ہو گئے۔

تو اب مجھے کہہ لینے دیجئے کہ جس چیز پر آقائے دو جہاں کی انگلیاں بڑ جائیں اس پر آگ نہیں اتر کر سکتی۔ تو بھلا جس شکم مادر میں تو مجھے مسلسل نور مصطفیٰ نے اپنی جلوہ ریزی و ضیاء پاشی کی ہو اس پر آگ کیوں کر اتر کر سکتی ہے۔
فَاَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ۔

حضرات سے! اس سے معلوم ہوا کہ ہم نے رسول اللہ کو حضرت آمنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی قبر پر دیکھا۔ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہدائے احد کی قبر پر دیکھا۔

اچھا تو آپ لوگ یہ بتائیے کہ نبی اس دنیا میں مبعوث کیوں کیا جاتا ہے؟ شرک پھیلانے کے لئے یا شرک مٹانے کے لئے؟
جواب۔ شرک مٹانے کے لئے۔

لہذا آپ خود ہی فیصلہ فرمائیں کہ اگر قبروں پر جانا شرک ہوتا تو وہ نبی جو شرک مٹانے کے لئے آیا تھا وہ بھلا قبروں پر کیسے جاسکتا تھا۔
اگر قبروں پر جانا شرک ہوتا تو منصب رسالت و نبوت کے خلاف ہے کہ قبر پر نبی کو دیکھا جائے۔

معلوم ہوا کہ قبر والوں کو بھلایا نہیں جاتا بلکہ ان کو یاد رکھا جاتا ہے۔ جو لوگ قبروں کے مخالف ہیں مرید گے تو پھر حال۔ مگر ان کی قبروں پر آدمیوں کے بجلے کچھ اند نظر آئیں گے۔

حضرات! جب بات آہی گئی ہے تو دو ایک واقعہ اور سماعت فرمائیں آفتاب نبوت کے غروب ہونے کے بعد لوگوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی قبر پر دیکھا پھر جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وصال ہوا تو امیر المومنین خلیفۃ المسلمین حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سرکار کے آغوش میں سپرد کردیا گیا۔ اب حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو دونوں قبروں پر دیکھا گیا۔

اس کے عہد فاروقی ہے چنانچہ حضرت سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وصال کے بعد اب حضرت عائشہ صدیقہ کو تینوں قبروں پر حاضری دیتے دیکھا گیا۔ البتہ فرق اتنا ہے کہ خلیفہ دوم حضرت سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دفن ہو جانے کے بعد اب حضرت عائشہ صدیقہ نے چہرے پر نقاب ڈال لیا تھا۔

لوگوں نے وقحہ دریافت کی تو آپ نے فرمایا رب سے پہلے میرے شوہر کی قبر تھی۔ ان سے پردہ کیسا۔ اس کے بعد میرے والد کی قبر تھی ان سے بھی پردہ کیسا۔ البتہ فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے غیر محرم سے میں نے پردہ کیا

ایک نکتہ: اس سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اگر دیکھ نہیں رہے ہیں تو ان سے پردہ کیسا؟ بس سمجھ میں آیا جب سرکار کے غلام اپنی قبروں میں زندہ رہ سکتے ہیں تو پھر نبی کی حیات پر مناظرہ و مباحثہ کیسا؟

معلوم ہوا کہ دنیا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی قبر پر دیکھا۔ اور حضرت صدیقہ کو بھی۔

سلسلہ رفاغیہ کے مورث اعلیٰ حضرت سید احمد کبیر رفاغی رحمۃ اللہ علیہ نے قبر رسول پر حاضری دی۔ صحابہ کرام نے حاضری دی۔ گویا ہم نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو قبر پر دیکھا۔ حضرت عائشہ صدیقہ کو قبر پر دیکھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جمعین کو قبر رسول پر دیکھا۔ ایسے ہی حضرت سیدنا امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو جب کسی مسئلہ میں مشکل درپیش آتی تو آپ امام الامہ حضرت سیدنا امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مزار مبارک پر حاضری دیتے۔ اور کبھی ہوئے مسئلہ میں صاحب مزار سے استہداد و استعانت چاہتے۔

چنانچہ حضرت امام شافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کہنا ہے کہ جو مسئلہ گھر میں حل نہ ہوتا وہ حضرت سیدنا امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر اطہر پران کے روحانی فیوض و برکات سے آن کی آن میں حل ہو جاتا۔ گویا ہم نے امام شافعی رضی اللہ عنہ کو حضرت سیدنا امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر پر دیکھا۔ اور اس سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ قبر پر جبنا بھی درست ہے اور ان سے استہداد و استعانت بھی جائز۔ اور یہ حقیقت بھی بے نقاب ہو گئی کہ صاحب مزار دیکھتے ہیں سننے ہیں۔ سمجھتے ہیں اور مدد بھی فرماتے ہیں۔

کیا ہو گیا آج کے غیر مقلدین کو، کہ آئین باجہر اور رفع یدین جیسے مسائل میں تو حضرت سیدنا امام شافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مقلد ہیں۔ اور جب قبر پر جانے کی باری آتی ہے تو کنبہ حضری کو صنم اکبر کہا جاتا ہے۔

بہر حال ہم نے مالک ہندوستان خواجہ خواجگاں، سلطان الہند حضرت خواجہ غریب نواز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری کے مزار پر دیکھا۔ ہندوستان کے اکابر اولیاء اللہ نے اجیر شریف حاضری دی سلاطین مغلیہ میں اکبر و جہانگیر شاہجہاں اور حضرت عالمگیر نے حاضری دے کر اکتساب فیض کیا۔

اگر قبروں پر جانے والے یہ سب کے سب مشرک قرار پائیں تو اب اس روئے زمین پر مسلمان کہاں ڈھونڈا جائے؟

بہر حال ہم نے قبر پر جلسے والوں کی ایک دستاویز تیار کر دی اگر آپ لوگ اس کی اجازت دیں تو اب اس دستاویز پر ایک آخری ہر لگا دی جائے تاکہ قانونی کارروائی بالکل پختہ ہو جائے۔

حضرات! آپ میں سے بہت سے لوگ حاجی ہوں گے۔ آپ میں سے

کوئی صاحب یہ بتائیں کہ کیا حج کی مقبولیت کی دلیل لے کر آپ آئے ہوئے ہیں؟
کوئی نہیں۔ کیا معلوم ہوا؟ تین ساڑھے تین مہینے ادائیگی حج کے لئے مکہ مکرمہ میں
سے لیکن قبولیت نہ مل سکی۔ مگر میرے آقا جسے رب نے رحمت تمام بنا کر بھیجا ان
کا کرم، ان کی شفقت و عنایت دیکھو۔ وہ فرماتے ہیں:

مَنْ سَأَلَ عَنْ قَبْرِى وَجَبَتْ لَهُ شَفَاعَتِى

جس نے میری قبر کی زیارت کی اس پر میری شفاعت واجب ہوگئی۔
اب تم لوگ بتاؤ کہ قبر پر بلایا جا رہا ہے یا قبر پر سے بھگایا جا رہا ہے
اور صرف بلایا ہی نہیں جا رہا ہے بلکہ سرکار کی نظر میں قبر کی حاضری اس قدر محبوب
و پسندیدہ ہے کہ شفاعت کی لایح دے کر بلایا جا رہا ہے جس طرح بچہ کبھی والدین
کے قریب نہیں آتا۔ بلائے سے اور گریز کرتا ہے تو اسے بسکٹ اور ٹافی کی لایح دے
کر بلایا جاتا ہے۔ کچھ اس طرح کا نقشہ یہاں بھی ہے۔ اگر ویسے آنا نہیں چاہتے، تو
شفاعت کی لایح میں آئے۔ میں تم کو یہ ضمانت دے کر رخصت کر دوں گا۔ کہ کل میں
تمہاری شفاعت کر دوں گا۔ اللہ اکبر۔

یہ ہے قبر رسول کی حاضری کا صلہ۔ کہ اگر تم مجھے نہ ڈھونڈ سکو گے تو میں ڈھونڈ
لوں گا۔

حاجی ایک زخمی دل کے ساتھ واپس ہو رہا تھا سرکار نے یہ بشارت دے کر
اس کے زخموں پر نمک نہیں چھڑکا بلکہ مرہم رکھ دیا۔ اس کے باوجود بھی عقل کا اندھا کہتا
ہے کہ قبروں پر نہیں جانا چاہئے۔

میری ترتیب دی ہوئی دستاویز کی یہ ایک ایسی مہر ہے جس نے اباطیل کی
تابوت میں ایک آخری کیل ٹھونک دی ہے۔

حضرات سے! عنوان کی ایک ذیلی گفتگو میں آپ پر یہ واضح ہو گیا کہ
قبروں پر جانا بھی درست ہے اور ان سے استمداد و استعانت بھی جائز ہے۔
اس مضمون پر آپ میری دوسری تقریر سماعیت فرمائیں۔

اب آئیے اپنے اصل موضوع سے وابستہ ہو جائیے یعنی یادوں کو مٹایا
نہیں جاتا ہے بلکہ اسے برقرار رکھا جاتا ہے جس کی متعدد مثالیں آپ کو فریضہ حج
میں مل جائیں گی۔ مثلاً ادائیگی حج میں حاجی "سعی بن الصفا والمروہ" کرتا ہے۔ صفا و
مروہ یہ دو پہاڑیاں ہیں جس پر دوڑ کر آدمی سات پھیرے لگاتا ہے۔ صفا سے مروہ
پر اور مروہ سے صفا پر۔

اب اگر کوئی اس سے یہ پوچھے کہ حاجی صاحب اگر حج پہاڑیوں پر دوڑ
کا نام ہے تو ہندوستان میں پہاڑ اور پہاڑیوں کی کیا کمی تھی؟ کوہ ہمالہ کھڑے
اس پر دوڑ لیتے۔

تو حاجی بڑی سنجیدگی سے جواب دے گا کہ ایسا نہیں ہے۔ یہ وہ پہاڑی
ہے جس پر حضرت سیدتنا ہاجرہ دوڑ لگا چکی ہیں۔ سائل پھر سوال کرتا ہے کہ حضرت
ہاجرہ کیوں دوڑی تھیں؟ حاجی صاحب جواب دیں گے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام
اسی مقام پر حضرت ہاجرہ و حضرت اسماعیل علیہما السلام کو چھوڑ گئے تھے۔ حضرت
اسماعیل کی زبان شدت پیاس سے باہر نکل آئی۔ نہ کہیں کنواں تھا نہ چشمہ،
نہ ندی تھی نہ تالا۔ نہ تالاب تھا نہ دریا۔ حضرت ہاجرہ سے شہزادے کا یہ حال
دیکھا نہ گیا تو حضرت ہاجرہ نے پانی کی لالچ میں دوڑ لگایا۔ شاید کہیں پانی کی
چند بو مل جائے یا کسی چشمے یا کنواں کا سراغ لگ جائے۔

سائل پھر سوال کرتا ہے حاجی صاحب حضرت سیدہ ہاجرہ کا دوڑنا
تو بھرمیں آگیا کہ وہ پانی کی تلاش میں دوڑی تھیں مگر آپ کو پانی کی کیا کمی؟ آج
تو مکہ جل محل ہو گیا ہے۔ آپ کیوں پریشان ہیں؟

حاجی صاحب کا جواب یہی ہو گا کہ میں پانی کی تلاش میں نہیں دوڑ رہا
ہوں بلکہ دوڑ لگا کر حضرت ہاجرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے دوڑ لگانے کی یاد
تازہ کر رہا ہوں۔ یہ وہی پہاڑی ہے جس پر اللہ تبارک و تعالیٰ کی ایک محبوب
بندی دوڑ چکی ہیں۔ اگر ہم نہ دوڑیں گے تو ہاجرہ کی یہ ادامٹ جائے گی۔ اور

اسلام چاہتا ہے کہ اچھوں اور پیاروں کی ادائیں مثانی نہ جائیں بلکہ ان کو زندہ رکھا جائے۔ اور یہی یاد ان کی تاریخ کو دہراتی رہے گی۔

معلوم ہوا کہ حضرت اجمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی یاد کو مثانی نہیں کیا بلکہ زندہ رکھا گیا۔ اور حد تو یہ ہے کہ حج جیسے فریضہ ارکان میں شامل کر لیا گیا۔ اب اس کے منکرین کو اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل چاہئے؟

اور آگے بڑھئے ارکان حج میں یہ بھی ہے کہ حاجی کو طواف کعبہ بھی کرنا ہے طواف کعبہ میں سات پھیرے لگانے ہیں۔ حج اسود کو بوسہ دے کر پھرو ہیں آنا ہے پھر وہیں سے چل کر وہیں آئے گا۔

اس طرح اس کو سات چکر لگانا ہے لیکن ان کے سات پھیروں میں تین بار ”رُمل“ کرنا ہے۔ یعنی وہ سینہ تان کر اکڑ کر چلے گا۔ چونکہ آقائے کائنات جب صحابہ کرام کو لے کر طواف کعبہ کی غرض سے تشریف لائے تھے تو صحابہ اپنی علالت کے باعث بہت کمزور و نحیف نظر آ رہے تھے اس پر کفار مکہ نے بطور طعن کہا کہ ایسے کمزور و نڈھال لوگ کیا طواف کعبہ کریں گے۔ صحابہ کرام نے یہ بات سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تک پہنچائی۔ کہ کفار مکہ ایسا کہہ رہے ہیں۔ اس پر آقائے دو عالم نے ارشاد فرمایا کہ تم لوگ جب طواف کرو تو اس میں ”رُمل“ کرو۔ تاکہ ان پر تنہاری ہیبت کا سکہ جم جائے۔

چنانچہ سرکا دو عالم نے بھی ”رُمل“ فرمایا۔ اور صحابہ کرام نے بھی۔ اب آج حاجی سے پوچھا جائے کہ تم ”رُمل“ کیوں کرتے ہو تو اس کا جواب یہی ہوگا، کہ سرکارِ صحابہ کی ”رُمل“ کی وجہ تو وہ تھی جسے ذکر کیا گیا۔ لیکن ہمارے ”رُمل“ کی وجہ یہ ہے کہ سرکار کی ادا باقی رہ جائے۔

قد نیاں بیت گئیں لیکن اس ادا کو مٹنے نہیں دیا گیا۔ اس کے شواہد ملتے جارہے ہیں کہ یادیں مثانی نہ جائیں بلکہ ان کو زندہ رکھا جائے۔ انہیں کیا زندہ رکھنا ہے۔ بلکہ خود اسیں ہی زندگی کا راز پنہاں ہے۔ گویا تم اگر جینے کی طرح جینا

چلتے ہو تو ان یادوں کو مٹاؤ نہیں بلکہ ان کو زندہ رکھو۔

عہد رسالت کی ایک اور بات آپ کو یاد دلائیں۔ ایک بار آقائے دو جہان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ اسی اثناء میں بچوں کی ایک ٹولی گزری جو اذان کی نقل کر رہے تھے۔ کوئی حسی علی الصلوٰۃ کہہ رہا ہے۔ کوئی اشراک کہہ رہا ہے۔ بچے تو بچے انھیں میں ایک صاحبزادہ ابو دردار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بھی تھے ان کی آواز بہت پیاری تھی۔

آقائے دو عالم نے اشارہ کر کے ابو دردار رضی اللہ عنہ کے صاحبزادہ کو بلایا۔ ان کی پیشانی کے لگے بالوں پر دست شفقت پھیرا۔ دعائیں دیں۔ اور رخصت کر دیا۔ شہزادے نے گھر جا کر اس کا تذکرہ اپنی ماں سے کیا کہ آج ہم ساتھیوں کے ساتھ اذان کی نقل کرتے گزرے تھے کہ اسی اثناء میں ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قریب گزرے۔ میرے آقا کی نگاہ انتخاب کا کیا کہنا بس مجھ کو اپنے قریب بلایا۔ میری پیشانی کے لگے بالوں پر اپنا دست کرم رکھا۔ اور دعائیں دے کر رخصت فرمایا۔ وہ صحابیہ ماں سن کر جھوم گئیں۔ اور فرمایا بیٹے، زندگی میں خواہ کتنی ہی بار بال مندواؤ یا ترشواؤ مگر خبردار خبردار ان بالوں کو نہ مونڈوانا جس پر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ہاتھ پڑ گئے ہیں۔

ان کو بطور تبرک اور یادگار چھوڑ دو تاکہ اس بات کی نشانی رہے کہ یہ وہ بال ہے جس پر آقائے دو جہاں نے دست شفقت پھیرا ہے۔ اس کے توسل سے خدا سے دعائیں مانگی جائیں۔

غور فرمائیے! اس عہد کا عقیدہ تھا کہ یادگاروں کو مٹایا نہ جائے بلکہ اس کو باقی رکھا جائے۔

واضح رہے کہ جن بالوں پر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی انگلیاں

بڑ جائیں۔ تو ان بالوں کو نہیں مٹایا جاسکتا تو جس دن آقائے دو جہاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے قدمِ سیمینت لزوم سے اس خاکدانِ گیتی کو نوازا جو آپ کا یوم ولادت ہے۔ بھلا عقیدت کیش اور خوش عقیدہ مسلمان اس دن کو مٹنا کیسے بڑاشت کر سکتے گا۔

وہ اسلامی نقطہ فکر کو خوب اچھی طرح جانتا اور سمجھتا ہے کہ اسلام کا یہ دیا ہوا ذہن و مزاج ہے کہ تاریخی دنوں کو مٹایا نہیں جاتا۔ بلکہ انھیں زندہ رکھا جاتا، اسی میں ہماری قومی زندگی کا راز مفر ہے۔ اور کوئی بھی زندہ و بیدار مغز قوم اپنی سنہری تاریخ کا چہرہ مسخ ہوتے برداشت نہ کرے گی۔

لہذا معلوم ہوا کہ آج اگر کوئی مسلمان اپنے اسلاف کی یادیں مٹاتا ہے تو یہ کوئی مفروضہ یا اختراع محض نہیں بلکہ یادوں کا مٹانا یہ ایک ایسی زندہ جاوید حقیقت ہے جسے اسلام نے ہمیشہ کے لئے اپنے کلیہ سے لگا رکھا ہے۔

حضرات! اختتام گفتگو پر ایک واقعہ اور ملاحظہ فرمائیے:

اکابر سلسلہ چشتیہ میں آپ نے سلطان چراغ الدین دہلوی اور حضرت سید بندہ نواز گیسو دراز رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا نام نامی سنا ہو گا۔ حضرت سلطان نصیر الدین چراغ دہلوی، دہلی میں آرام فرما ہیں۔ اور بندہ نواز قطب دکن کی حیثیت سے کلبرگہ شریف میں روحانی فیوض و برکات ناسپہ ہیں۔ جہاں پر صبح و شام کثرتِ جلنے والے زائرین کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ انھیں گیسو دراز کیوں کہا جاتا ہے؟

ایک بار بندہ نواز بیٹھے تھے اور اسی طرف سے آپ کے پیر و مرشد حضرت سلطان چراغ دہلوی گھوڑے کی سواری سے گزرے۔ حضرت بندہ نواز دیکھے ہی مرشد برحق کی جانب پکے اور بڑھے۔ اور آکر زانوئے مبارک کا بوسہ دیا۔ پیر نے فرمایا اور جھک کر چنانچہ دوبارہ جھک کر تلوسے کو چوما۔ فرمایا اور جھک کر پھر گھوڑے کی رکاب کو بوسہ دیا۔ فرمایا اور جھک کر پھر گھوڑے کی سُر یعنی

ٹاپ کو چوما۔ ہر بار کے جھکنے میں پر نہ جانے کتنے مراتب طے کر دیے اور کتنے درجہ کی بندی عطا فرمائی۔

چنانچہ چوتھی بار سم کو بوسہ دینے کے لئے بندہ نواز جھکے تو رکاب میں بال اکھ گیا حتیٰ کہ سم کو بوسہ دینے کے لئے جھکے گئے اور بال بڑھتا گیا چونکہ پیر کی اطاعت میں یہ بال بڑھے تھے لہذا بطور یادگار اتنے بالوں کو ہمیشہ کے لئے پھوڑ دیا۔ اسی لئے ان کو گیسو دراز کہا جاتا ہے۔

ان تمام واقعات سے پتہ چلا کہ بزرگوں۔ اسلاف اور تاریخ ساز ہستیوں کی یادوں کو مٹایا نہیں جاتا بلکہ انھیں برقرار رکھا جاتا ہے اور یہی ہمارا مضمون ہے۔
۲۔ آئیے ایک پتے کی بات بتا دیں۔ ایک یاد ان لوگوں کی بھی ہے اور وہ ہے ”رمی جمار“ ارکان حج میں ایک رکن یہ بھی ہے کہ شیطان کو کنکری ماری جاتی ہے۔ رمی کے معنی پھینکنے کے ہیں۔ جمار کے معنی ”کنکری“۔ اسی لئے اس کو رمی جمار کہتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں شیطان سیدنا اسماعیل ذبیح اللہ کو بھگانے جا رہا تھا۔ جب خدا کے حکم سے حضرت سیدنا ابراہیم خلیل اللہ اپنے نور نگاہ حضرت سیدنا اسماعیل کو ذبح کی غرض سے لے چلے تھے تو شیطان بھی پیچھے لگ گیا تھا۔ اس نے حضرت سیدنا اسماعیل علیہ السلام سے طرح طرح کے سوالات کئے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اس کے جوابات مرحمت فرمائے۔ آخر شیطان نے ترکش کا آخری تیر پھینکا اور کہا کہ تمہارا باپ تمہیں ذبح کرنے کی غرض سے لے جا رہا ہے۔ اس نے سمجھا تھا کہ جان تو سبھی کو پیاری ہوتی ہے یہ سننے، محو اسماعیل کا قدم ڈگمگا جائے گا۔ مگر نبی زادے نے برہنہ جواب دیا۔ موت برحق ہے۔ مگر اس وقت کتنی پیاری ہوگی کہ بیٹا باپ کے ہاتھوں ذبح کیا جائے۔ بیٹا دم توڑ رہا ہو اور باپ کا چہرہ آنکھوں کے سامنے ہو۔

شیطان اپنا سامنہ لے کر رہ گیا اور مایوس ہو گیا۔ اور سوچا یہاں کوئی جادو کام نہیں کر سکے گا۔

چنانچہ اسلام نے حاجیوں پر لازم قرار دیا کہ وہ یہاں آکر رومی جمار کریں
یعنی شیطان کو کٹکری ماریں وہاں شیطان کا پتلا نہیں ہے۔ یہ رکن صرف اسلئے
ادا کیا جاتا ہے کہ حضرت خلیل اللہ اور حضرت ذبیح اللہ کی یاد باقی رہ جائے۔
مگر مجھے حیرت ہے کہ آج تک ہمارے حریف نے اس کے خلاف سعودیہ
عربہ سے کوئی احتجاج نہیں کیا کہ صدیوں سے ہمارے لکڑ دادا پر پتھر اور مورہا
ہے اب تو ان پر رحم کیا جائے۔ سر پر کوئی بال تک نہیں رہ گیا ہوگا۔ جب آپ کے
عہد میں بھی ایسا نہ ہو سکے گا تو پھر کبھی نہیں ہوگا۔ وہ تو آپ کے بھی مائی باپ ہیں۔

اس کا فلسفہ آپ جانتے ہیں کہ ان کے کان پر کیوں جوں تک نہیں
رینگتی محض اسلئے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ سنیوں کی تو بہت سی یادیں ہیں جب دیکھو
غوث کی یاد ہے، خواجہ کی یاد ہے۔ امام حسین کی یاد ہے۔ حضرت اویس قرنی کی
یاد ہے۔ امام اہلسنت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی یاد ہے
مگر ہماری تو بس یہی ایک یاد ہے اگر یہ بھی مٹ گئی تو پھر ہم کہیں کے نہیں رہیں گے
معلوم ہوا جو جیسا ہوتا ہے اس کی یادیں بھی ویسے ہی منائی جاتی ہیں۔
غوث و خواجہ محبوب خدا ہیں۔ لہذا ان کی فاتحہ دلائی جاتی ہے۔ لوگ ان کے نام کا
تبرک کھاتے ہیں۔ بریانی، زردہ، دلیا، کچڑا، حلوہ وغیرہ۔ مگر شیطان دشمن غفلت
ہے تو اس پر پتھر اور کیا جاتا ہے۔ تاکہ اسی سے بکھر میں آجائے۔ کہ کس جرم کی سزا مل
رہی ہے۔

حضرات! منیٰ طور پر حضرت اسماعیل کا ذکر آگیا تھا کہ شیطان
ایک نیکوتر نے بہکانا چاہا مگر ان کے قدم میں لغزش و دوگناہٹ تک نہ
آئی۔ وہ جادہ استقامت پر علیٰ حالہ باقی رہے۔
آپ غور فرمائیں کہ حضرت اسماعیل میں یہ شجاعت و دلیری یہ توانائی

و بہادری کہاں سے آئی۔ مجھے کہہ لینے دیجئے حضرت اسماعیل اس نور کے امین ہیں جو کبھی حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے صلب میں تھا۔ جس نے ابراہیم خلیل اللہ کو نارِ نرود سے بچا یا تھا۔ وہ انگارے ان پرانگارے نہ رہ گئے بلکہ پھول سے بھی زیادہ نرم و نازک اور برف سے کہیں زیادہ ٹھنڈے ثابت ہوئے۔ یہ سب نورِ مصطفیٰ کی بدولت ہے لیکن اب حضرت سیدنا اسماعیل علیہ السلام اس نور کے امین بن گئے تھے۔

حضرت اسماعیل اس حقیقت کو جانتے تھے کہ اگر میں ذبح کر دیا گیا تو یہ تنہا میرا ذبح نہ ہوگا۔ بلکہ آسمان کے ستارے جھڑ جائیں گے۔ سمندر خشک ہو جائے گا۔ پہاڑ روئی کا گالا اور آسمان ریزہ ریزہ ہو جائیگا۔ اسلئے کہ میں تو اس نور کا امین ہوں کہ یہ کائنات جس کے لئے بنائی گئی ہے اور جس کے صدقے میں بنائی گئی ہے۔ ابھی تو اس کا ظہور ہوا ہی نہیں ہے۔ لہذا وہ ذبح میرا تنہا نہ ہوگا بلکہ کائنات نہ وبالا ہو جائے گی اور قیامت سے پہلے ایک قیامت آجائے گی۔

لہذا ان کے لئے طمانیت و سکون اسی نور پاک کا بخشا ہوا ہے جسے قدرت نے انھیں ودیعت کر دیا ہے۔ فَاَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ۔

ان متعدد مثالوں میں آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ اسلام یا دلوں کو مٹانا نہیں چاہتا بلکہ ان کو برقرار رکھنا چاہتا ہے۔

دوستو! اب مجھے ایک بات بتاؤ۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کہا جاتا ہے تو کیا سچ ہے وہ ذبح کر دیئے گئے تھے۔ اسلامی گھرانے کا بچہ کبہ جانتا ہے کہ حضرت اسماعیل ذبح نہیں ہوئے بلکہ ان کی جگہ رب تبارک و تعالیٰ نے ایک جانور بھیج دیا۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی چھری چل رہی تھی۔ آنکھوں پر پٹی بندھی تھی وہ ہی سمجھ رہے تھے کہ میں بے کوز ذبح کر رہا ہوں۔ خدا بندوں کی نیت پر مطلع ہے۔ ہم کام دیکھ لیں تو حکم لگائیں۔ مگر خدا بندوں

کی نیت ان سے بھی زیادہ جانتا ہے۔ جتنا خود بندہ نہیں جانتا۔

چنانچہ رب نے اس قربانی کو منظور کر لیا کہ باپ بیٹے یعنی خلیل و ذبیح دونوں کے دونوں اپنے ارادے میں یکے اور یکے ہیں۔

بھائیو! مگر یہ تو ایک کھلی حقیقت ہے کہ حضرت اسماعیل ذبیح نہیں ہوئے بلکہ جانور ذبیح ہوا۔ چونکہ وہ جانور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے عوض ذبیح ہوا تھا۔ لہذا اس کے ذبیح کی نسبت خود حضرت اسماعیل کی طرف کر دی گئی۔ اس طرح کا استعمال تو ہمارا اور آپ کا روزمرہ کا ہے مثلاً ایک باپ اپنے بیٹے کی موت پر کہتا ہے: ارے میں خود مر گیا، وہ واقعہً مر نہیں گیا بطور مجاز بول رہا ہے۔

اب اگر آپ لوگوں سے کوئی پوچھے کہ حضرت عیداضھیٰ اور عید قرباں کیا ہے تو اب اس کا مشترکہ جواب ہو گا کہ اس مقدس و پاکیزہ تہوار میں ہم لوگ اپنے اللہ کے برگزیدہ و مقبول نبی حضرت سیدنا ابراہیم خلیل اللہ و حضرت سیدنا اسماعیل ذبیح اللہ کی یاد مناتے ہیں۔ تاکہ اللہ کی راہ میں نہ صرف مال خرچ کرنے کا ہی جذبہ ہو بلکہ جان تک دینے کا حوصلہ زندہ و سلامت ہے۔

اگر یہ یار دین ہماری اسلامی زندگی سے نکال دی جائیں تو ہماری زندگی مفلوج و معطل ہو سکے رہ جائے۔

اسی لئے تو اسلام یا دون کو مٹانا نہیں چاہتا بلکہ اسے زندہ رکھنا چاہتا ہے۔ ذہن کی کشادگی، روح کی بالیدگی، اعمال میں تقویٰ، نگاہ کی بلندی، بازوؤں میں قوت، احساس کی برتری، فکر کی توانائی، حوصلے کی بلندی، مغرور سے نفرت، تواضع سے محبت، دنیا سے بے رغبتی، دین سے وابستگی۔

غریبکہ یہ ساری دولتیں انھیں یادوں کے کشکول میں اکٹھا ہیں یادیں
مناتے جاؤ اور تہی دامن دور ہوتی جائے یہ کچھ خواجہ کے در سے لو، کچھ شہنشاہ بغداد
سے، کچھ کلیر سے تو کچھ کر بلا سے، کچھ مارہرہ سے تو کچھ بریلی سے۔ بہر حال جب تک
ان کی یادیں مناتے رہو گے زندگی سنورقی اور نکھرتی رہے گی۔ اور جب ان کے
رنگ وانی کرو گے تو یا تو کوٹھو کے بیل بن جاؤ گے یا کچھ اور۔ دھوبی کا گدھا، نہ
گھر کا نہ گھاٹ کا۔

اں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر پوچھا جائے کہ عید منی، عید قرباں کیا
ہے؟ تو آپ ہی جواب دیں گے کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ و حضرت اسماعیل علیہ
السلام کی یاد ہے۔

حضرات! اب مجھے کہہ لیے دیکھئے کہ حضرت اسماعیل ذبح نہیں گئے
مگر اسلام نے ان کی اس قربانی کو اتنی اہمیت دی کہ مستقلاً اسے ایک تہوار بنا
دیا۔ تاکہ سال بہ سال ہم ان کی یادیں مناتے رہیں جس سے رگوں میں نئی حرارت
اور نئی زندگی کے آثار نمودار ہوں۔

لہذا اب مجھے کہنے دیجئے کہ حضرت اسماعیل ذبح نہیں ہوئے مگر پھر بھی
اسلام ان کی یاد مناتا ہے۔ یا للعجب! کہ کر بلا میں جانور نہیں ذبح کئے گئے۔
بلکہ نواسے رسول جگر گوشہ بتول، علی اصغر، علی اکبر، قاسم و عون و محمد کی لاشیں
کر بلا میں تڑپیں تو کیا اب بھی آپ مجھے نہ کہنے دیں گے کہ جو حضرت ابراہیم کے شہزادے
کی یاد منا سکتا ہے وہ نواسے رسول کی یاد منانے پر کیوں کر ہرہ بٹھا سکتا ہے۔
جب حضرت ابراہیم کے شہزادے کی یاد منائی جاسکتی ہے تو بدرجہ اولیٰ مصطفیٰ
کے نواسوں کی بھی یاد منائی جاسکتی ہے۔

وہ کیسے شفیق القلب، کج فکر و کج فہم ہیں جو یاد حسین یوم حسین پر بندش

لگانا چاہتے ہیں۔ اے عقل کے دشمنوں! اگر ان مراہم میں عوام کے افکار و خیالات اور اعمال و کردار میں کچھ خامیاں آگئی ہوں تو ان کا ازالہ کرو۔ ان کے مٹانے کی کوشش کرو۔ لیکن اصل تاریخ کر بلا پر تو دھول مٹ جھونکو۔ اس پر ایسی تیشہ کاری نہ کرو کہ واقعات کی اصل صورتیں مسخ ہو جائیں۔

اب تمہاری جرأت بیتاب اپنے حدود سے اس قدر تجاوز کر گئی ہے کہ یزید تو برحق اور حسین ناحق کہنے لگے۔ او یزید کو رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ کہنے لگے۔ ٹھیک ہے اگر تمہاری نظر میں یزید برحق تھا تو قیامت کے بعد وہیں ہونا جہاں یزید کا ٹھکانا ہو۔

حضرت! میں نے بہت زیادہ آپ کا وقت لے لیا۔ آج کے عنوان کے لئے میں نے قرآن کی یہ آیت کریمہ تلاوت کی تھی

وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى

ابنا لیجئے کہہ لینے دیجئے مکمل دستاویز کی آخری ہرے جس سے مجال انکار نہیں۔ گھر خدا کا ہے اور نقش قدم خلیل کا۔

اگر یادوں کا منانا جرم ہوتا تو قرآن نہ کہتا کہ مقام ابراہیم کو اپنی سجدہ گاہ بناؤ۔ بلکہ یہ کہا جاتا کہ اللہ کے گھر سے اسے الگ کیا جائے۔ لیکن کوئی اور نہیں۔ خدا خود فرماتا ہے کہ کہیں اور نہیں میرے ہی گھر میں میرے محبوب کا نقش قدم رہنے دو۔ تاکہ معمار اول کی حیثیت سے ان کی یاد ہمیشہ کے لئے قائم و دائم رہے۔

عمر تمام رفت بیاتاقصنا کنیسم
عمریکہ تبے حضور صراحتی و جام رفت؟

سراج منیر

نَحْمَدُهُ وَنُصَلِّي عَلَى رَسُولِهِ الْكَرِيمِ
اَمَّا بَعْدُ

فَاعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَكَلِّ عِيَالًا اِلَىٰ يَاسَا وَوَسْرًا جَامِنًا

حضرات! آج میری تقریر کا عنوان ہے "سراج منیر"
میں نے معمول کے مطابق، قرآن حکیم کے ایک مقدس حصے کی تلاوت
کی ہے ودا عیال الی اللہ باذنہ وسیرا جامینا۔

حضرات! میرا ہی نہیں، بلکہ قریب قریب ہر خطیب کا یہی معمول
ہے کہ ایک دینی و مذہبی اسٹیج کے لئے وہ "قرآن مجید" کی کسی بھی آیت
کو اپنی تقریر کا زین عنوان قرار دیتا ہے۔

چنانچہ میں نے بھی ایسا ہی کیا ہے اور اسی طرح ہر خطیب کا یہ
بھی معمول ہے کہ تلاوت کی ہوئی آیت کا پہلے ترجمہ کرنا ہے پھر اس
کی تشریح و توضیح، مجھے بھی معمول کے مطابق ایسا ہی کرنا چاہئے۔ مگر
میں نہیں سمجھ پا رہا ہوں کہ وہ کون سا ایسا داعیہ ہے جو آج مجھے اپنی متعین
و مقررہ روش سے گریز کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔

لہذا آج میں پہلے آیت کا ترجمہ نہ کروں گا بلکہ میرا دل یہ چاہتا ہے
کہ ترجمہ سے پہلے آج ہم اور آپ سب مل جل کر اس کا فیصلہ کریں کہ خود

”قرآن حکیم“ سے متعلق مسلمانوں کا اسلامی نقطہ نظر کیا ہے؟ اور اس سلسلے میں خود اس کی اپنی جنحی ملی راہ کی کیا ہے؟

میں اس بحث کو قصداً اس لئے اٹھا رہا ہوں کہ اگر ہم نے ”قرآن“ سے متعلق کوئی آخری اور قطعی فیصلہ کر لیا۔ اور اپنے اس ارادے میں کامیاب ہو گئے تو آیت کا مفہوم سمجھنے میں ہمیں بڑی مدد مل جائے گی۔

لہذا ہم اپنی اس سہولت کو، دائیگاں جانے دینا نہیں چاہتے لہذا اب کسی اور سے نہیں بلکہ یہ سوال خود قرآن ہی سے کیا جائے کہ اے قرآن تو کیا ہے؟

حضرات! اس کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ اس سوال کا جواب میں دیدوں، یا آپ میں سے کوئی اس کو حل کرے۔ لیکن میں ایسا بھی نہیں چاہتا۔ ہمارا اور آپ کا جواب تو ہلکا پھلکا ہو گا۔ میں چاہتا ہوں کہ خود ”قرآن“ ہی سے اس کا جواب حاصل کیا جائے۔ اگر قرآن نے خود اپنے منصب کو ظاہر کر دیا تو یہ جواب ہر جواب سے وزنی، قابل قبول اور مستند ہو گا۔ لہذا اب آئیے، ہم قرآن ہی سے سوال کریں کہ اے قرآن تو کیا ہے۔

حضرات! اگر قرآن سے یہ سوال کیا جائے کہ تو کیا ہے، تو قرآن کا یہ کہنا ہے کہ اے لوگو! تم مجھے قرآن کہو، عربی مجھے قرآن کہے، فرسی مجھے قرآن کہے، معنولی مجھے قرآن کہے، ایک ادیب مجھے قرآن کہے، صوفی اور درویش مجھے قرآن کہے، مخاذجنگ کا سپہ سالار، اور عابد شب زندہ دار مجھے قرآن کہے، درگاہی، خانقاہی مجھے قرآن کہے حاجی و نمازی مجھے قرآن کہے اپنے اور بیگانے مجھے قرآن کہیں غرض کہ ہماری کائنات مجھے قرآن کہے لیکن اگر تم مجھ سے پوچھتے ہو کہ میں کیا

ہوں تو سن لو زمین و زمان، فرش و عرش، ملک و فلک اور جن و بشر سب مجھے قرآن کہیں لیکن اگر مجھ سے پوچھتے ہو تو میرا کہنا ہے کہ میں بیانِ ادا ہوں جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا۔

حضرات! یہ تو نہ لفظوں کا زور ہے اور نہ ہی الفاظ کا گور رکھ دھندا۔ میں دلائل و براہین سے ہٹ کر فنِ خطابت کا جادو جگانا نہیں چاہتا جس کی حیثیت ریت کے دیوار یا شیش محل جیسی ہو۔ اردو کی کتابوں تک کا سہارا لینا نہیں ہے۔ بلکہ میں اس کے شواہد خود قرآن ہی سے پیش کروں گا۔

اب آئیے، قرآن حکیم کے پاس۔ میں آپ سب سے دریافت کرتا ہوں، بتائیے یہ کیا ہے لا اقسم بهذا البلدہ وانت جلد بهذا البلدہ یہ قرآن ہی تو ہے۔ قرآن ہی کی ایک آیت ہے۔
حضرات! قرآنی شواہد پیش کرنے سے پہلے آپ یہ ذہن نشین فرمالیں کہ میں ایسا کیوں کہہ رہا ہوں کہ ”قرآن“ میرے مصطفیٰ کا بیان ادا ہے۔ دیکھتے ہو نا کیا ہے!

چنانچہ مصطفیٰ کا، بتانا خدا کا۔ اسی کا نام قرآن ہے۔ سفر مصطفیٰ کا، بتانا خدا کا۔ اسی کا نام قرآن ہے۔ ہاتھ مصطفیٰ کا بتانا خدا کا اسی کا نام قرآن ہے۔ ادا اس ہونا مصطفیٰ کا، بتانا خدا کا اسی کا نام قرآن ہے۔ علم مصطفیٰ کا بتانا خدا کا اسی کا نام قرآن ہے۔ چہرہ مصطفیٰ کا بتانا خدا کا اسی کا نام قرآن ہے۔

پیارے! قرآن الٹو تو سہی دیکھنے کی طرح دیکھو تو پڑھنے کی طرح پڑھو، سمجھنے کی طرح سمجھو، غور کرنے کی طرح غور کرو۔ تب راز کھلے گا کہ اس آئینے میں صورت کس کی نظر آ رہی ہے، چہرہ کس کا ابھرا ہوا ہے، تجلی کس کی پھوٹ رہی ہے۔ کیا آپ کو یاد نہیں؟ جب صحابہ

کرام نے، حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے دریافت کیا کہ سرکار کا اخلاق کیسے؟ تو آپ نے جواب دیا "کان خُلِقَ القرآن" ان کا خلق قرآن ہی تو ہے۔

معلوم ہوا آئینہ رخسار مصطفیٰ میں قرآن کی تلاوت کی جائے جس میں مصطفیٰ کی ابھری ہوئی نگہروں میں قرآن کی تفسیر بڑھی جائے اور صحیفہ آسمانی میں مصطفیٰ کی خاموش اداؤں کا نظارہ کیا جائے اسی لئے میں اکثر یہ کہا کرتا ہوں کہ قرآن کو سمجھنا ہے تو مصطفیٰ سے پوچھو۔ اور مصطفیٰ کو سمجھنا ہے تو تقویۃ الایمان سے نہیں بلکہ قرآن سے پوچھو۔ اس سلسلہ میں اگر یہ رشتہ آپ نے برقرار رکھا تو انشا اللہ تعالیٰ گریہ آپ سے قریب نہ ہو سکے گی، اور عصر حاضر کے دجالوں کی فتنہ سامانیوں سے آپ بال بال بچ جائیں گے۔

حضرات! گفتگو یہ چل رہی تھی کہ میں اپنے دعوے کی دلیل میں اردو کی کتابوں کا سہارا نہ لوں گا، بلکہ خود قرآن ہی سے اس کے شواہد پیش کروں گا۔ چنانچہ اب آپ تمام حضرات فرمائیے یہ کیا ہے لا اُقیم بهذا البلد وانت حجة بهذا البلد یہ قرآن ہی کی ایک آیت تو ہے، قرآن ہی تو ہے۔

اب غور فرمائیے کہ آخر یہ ہے کیا، کہ اس کے رسول نے چلنے کا ارادہ فرمایا، زمین نے اپنا کلیجہ بڑھایا، فرش راہ نے اسی پلکیں بچھائیں، رہ گزرے اپنی پیشانی بچھائی، سرکار کہیں اہم سے گزرے، پسے کلیجے پر قدم رکھو، میری پلکوں کو روندو، میری پیشانی پر اپنا تلوار رکھ کر سر بلندی و سرفرازی عطا کرو۔ سرکار نے قدم بڑھایا، شاہراہیں قدم بوس ہوئیں، پگڈنڈیوں نے تلوار چومے کنکریوں نے اپنے کو موم بنا کر کلیجے پر ہمیشہ کے لئے نشان کھپائے مصطفیٰ لے لیا۔

اسی کو سرکار آسی نے فرمایا ہے

نہ میرے دل، نہ جگر نہ دیدہ تر پر

کرم کریں تو نشان قدم ہو پھر یہ

اعلیٰ حضرت نے فرمایا:

کھائی قرآن نے خاک گزر کی قسم

اس کعب پا کی حرمت پہ لاکھوں سلام

حضرات! میں یہاں یہ عرض کر رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے اپنا قدیم ناز بڑھایا تو جس زمین نے سرکار کا تلوا چھو ماب

پرور ہو گیا اسی زمین کی قسم یاد فرماتا ہے: لَا أُقْسِمُ بِهَذَا الْبَلَدِ

وَأَنْتَ جَدُّ هَذَا الْبَلَدِ اس شہر کی قسم جس نے میرے محبوب کا

تلوا چھو ما۔

حضرات! میرا کہنا یہی ہے چلنا مصطفیٰ کا، سنا نا خدا کا نام اسی کا

قرآن ہے۔ اگر آپ کو بھروسہ نہ ہو تو کل کی صبح اعلیٰ حضرت سیدنا امام

احمد رضا علیہ الرحمۃ والرضوان کا ترجمہ قرآن ”کنز الایمان“

ملاحظہ فرما کر اس کی تصدیق و صحت کر لیں۔ لیکن یہ خیال رہے کہ کسی گمراہ

کا ترجمہ نہ دیکھے گا جس گمراہ نے وَقَدْ جَدَّكَ صَالًا فَمَدَى كَا تَرْجَمَ

بیکیا کہ جب تمہارے رب نے تمہیں گمراہ پایا، بھٹکا ہوا پایا تو راہ دی

معاذ اللہ۔

عشق و محبت سے لبریز ”کنز الایمان“ کا ترجمہ قرآن ملاحظہ

فرمائیں اے محبوب ہم نے آپ کو اپنی محبت میں خود رفتہ پایا تو اپنی طرف

راہ دی۔

حضرات! اس قسم پر ایک بہت ہی لطیف بات یاد آگئی

ایک نکتہ:۔ توجہ چاہتا ہوں کیا آپ کو معلوم ہے کہ شریعت اسلامیہ میں

”قسم شرعی“ کیا ہے؟ غلات کعبہ کی قسم کھانا، ہرگز یہ قسم شرعی نہیں ہے کہ جس کے حائث ہونے یا قسم توڑنے سے کفارہ لازم آئے بلکہ قسم شرعی یہ ہے کہ میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں۔ اگر دارالقضاۃ میں قاضی مدعا علیہ سے قسم لے گا تو جیسا ضابطہ فقہ حنفی کا ”البینۃ علی المدعی والیہین علی من انکر“ یعنی مدعی سے قاضی دعویٰ کی شہادت طلب کرے گا اور جب وہ شہادت و بینہ پیش کرنے سے عاجز آجائے تو قاضی پھر مدعا علیہ کو قسم کھلائے گا تو کیا قاضی قرآن کی قسم کھلائے گا؟ غلات کعبہ کی قسم کھلائے گا؟ ایسا ہرگز نہیں۔ بلکہ وہ کہے گا ”اللہ قسم کھاؤ“ قربان جلیے میرے مصطفیٰ پر کہ پوری دنیائے اسلام کو جب قسم شرعی کی تعلیم دیں تو یہ فرمائیں کہ تم اللہ کی قسم کھاؤ۔ اور جب کائنات کا پروردگار قسم یاد فرمائے تو اس شہر کی قسم جھوٹے رسول اللہ کے قدم ناز کو چومنا ہے۔

کہاں ہیں اپنے جیسا بشر کیلئے سرکار سے اپنا کاندھا ملانے والے، ارے! ان کے تلوے کا مقام اتنا اونچا، جہاں تک بڑے سے بڑوں کا سر نہ پہنچے، پھر ان سے کاندھا ملانا اپنے جیسا بشر کتنا مساوات و برابری کرنا، یہ تو ٹینڈک کوڑکا کام ہوا، والی کہادت ہے۔ یہ حوصلہ کہ چوٹی چلی ہر ایک کو۔

حضرات! ابھی سلسلہ تمہید ختم نہیں ہوا۔ بات یہ چل رہی ہے کہ قرآن میرے سرکار کا بیان ادا ہے۔

بنانا خدا کا، نام اسی کا قرآن ہے۔ مثلاً سفر رسول اللہ کا۔

آخر معراج میں کون مچھا؟ میرے سرکار ہی تو تشریف لے گئے تھے مگر خدا کیا فرماتا ہے سبحن الذی اُسرى بعد بالیل الخ۔ حضرت! یہ پندرہویں پارہ کی ابتدائی آیت ہے۔ آخر قرآن

ہی تو ہے۔ لہذا میں نے کیا بجا کہا، یا کہاں مبالغہ سے کام لیا کہ تشریف
بیان ادا ہے میرے مصطفیٰ اکابر اس سفر میں میرے سرکار اتنی بلندیوں
پر گئے، جہاں جبریل کا ذہن نہ جاسکے، وہاں میرے مصطفیٰ کا توازن
جائے۔ پھر بھی اس صدی کا کھٹ مٹا۔ کہے کہ وہ میرے جیسے بشر؟ اس
کی تفصیل تقریر معراج میں ملاحظہ فرمائیے۔

حضرات! اور آگے بڑھئے: چل
ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہے

بیعت رضوان:- آقائے کائنات جب صحابہ کی مختصری تعداد ملے
کہ طواف کعبہ کے لئے تشریف لائے تو حضرت عثمان غنی کو بھیجا کہ وہ جا کر
کفار مکہ کو اس سے مطلع کر دیں۔ چنانچہ حضرت سیدنا عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ
عنه تشریف لے گئے۔ اور ادھر ان کے بارے میں یہ خبر اڑادی گئی کہ عثمان
غنی کو معاذ اللہ شہید کر دیا گیا

یہ خبر سننے ہی پر انکو بن علیہ التیمۃ والتسلیم ایک درخت ببول کے
سائے میں بیٹھ کر صحابہ کرام سے بیعت لینے لگے۔ اس طرح صحابہ کا ہاتھ نیچے
ہوتا اور آقائے دو جہاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ہاتھ ادا پر۔ یہی وہ بیعت
ہے جسے تاریخ اسلام "بیعت رضوان" کے نام سے یاد کرتی ہے۔ مجھے اس کے
تفصیل میں جانا نہیں ہے بلکہ اپنے موضوع کے تحت بہ عرض کر رہے کہ آقائے
دو عالم نے ایک ایک صحابی سے بیعت لی اور اخیر میں اپنے بانی ہاتھ کو
اٹھا کر یہ فرمایا کہ یہ عثمان کا ہاتھ ہے اور اس ہاتھ کو اپنے دائیں ہاتھ پر
رکھ کر عثمان غنی کی طرف سے بیعت لی۔ حالانکہ کفار مکہ نے یہ خبر پھیلا دی
تھی کہ عثمان غنی کو شہید کر دیا گیا۔ اللہ کے رسول کے عالم غیب ہونے کی
بین اور روشن دلیل ہے۔ اگر علم نبوت میں یہ بات نہ ہوتی تو عثمان غنی زندہ

ہیں تو ان کی طرف سے بیعت کے کیا معنی؟ ایک لغو اور بے معنی سی بات کہی جاتی مگر سرکار ان کی طرف سے بیعت لے کر بتانا چاہتے ہیں کہ عثمان غنی زندہ ہیں۔

چنانچہ اس بیعت سے متعلق، اگر صحابہ کرام سے دریافت کیا جاتا کہ طریقہ بیعت کیا تھا تو ہر صحابی بی فرماتے کہ ہمارا ہاتھ نیچے اور سرکار کا ہاتھ اوپر مگر آؤ اب قرآن کے پاس۔ قرآن کیا کہتا ہے اس کے متعلق قرآن کا ارشاد ہے **يَذُكُّ اللّٰهُ فَوْقَ اَمْنٍ دِيْمِيْدٍ** ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے۔

اللہ اکبر! معارج و مراتب کی یہ بلندی، اور علوئے مرتبت کا یہ حال۔ آنکھ دیکھے رسول کا ہاتھ، اور خدا فرمائے یہ تو میرا ہاتھ ہے۔ اس وقت میرا موضوع یہ ہے کہ ہاتھ مصطفیٰ کا، بتانا خدا کا اور نام اسی کا قرآن ہے۔ حضرات! اب تو بیت سے لوگوں کی آنکھوں کے دبیز پردے ہٹ گئے ہوں گے۔ اور انھیں یہ یقین ہو چلا ہو گا کہ یقیناً قرآن مصطفیٰ کے بیان ادا ہی کا نام ہے۔

ایک نکتہ: لیکن یہاں ایک نکتہ یہ سمجھ میں آیا کہ اللہ اپنے رسول کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ فرماتا ہے حالانکہ وہ خدا کا ہاتھ نہیں ہے وہ سب سے مقدس جسم و جسمانیات سے پاک و صاف اور برتر اور منزہ ہے۔ لہذا اس کے معنی بے جا نہیں گئے مابین بشارت، یعنی وہ جو اس کی شان کے لائق ہے۔ یہ آیت متشابہات سے ہے اور آیت متشابہات کے لفظی معنی کا نہ تو تعین کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس کے معنی حقیقی مراد لئے جاسکتے ہیں۔ اسکی مراد کو خدا ہی بہتر جانے۔ بس زیادہ سے زیادہ اس کی تعبیر میں یہی کہہ سکتے ہیں جو اس کی شان کے لائق ہے۔ مزید تفصیل و تشریح سے عقل انسانی عاجز

و قاصر ہے۔ مگر اس انداز بیان کو تو دیکھئے کہ خدا اپنے محبوب کے ہاتھ کو اپنا فرمائے اور سرکار اپنے ہاتھ کو عثمان غنی کا ہاتھ فرمائیں۔
 پہونچا کہاں سے ہے کہاں سلسلہ دراز عشق
 اس سے بارگاہ رسالت میں سیدنا عثمان غنی کی محبوبیت مقبولیت
 کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

حضرات! میں نے ہی تو کہا تھا کہ ہاتھ رسول کا، بتلنے والے خدا،
 اور اسی کا نام قرآن ہے۔
 اور آگے بڑھئے:-

ایک ایسا مقام جہاں سرکار نے کافروں کی جانب اپنی مٹھی سے
 دھول اور کنکری پھینکی، ان میں ایک ایک سے دریافت کیجئے کہ
 کس نے پھینکا تو ہر دیکھنے والا ہی کہے گا کہ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے
 پھینکا۔ لیکن اب قرآن کے قریب آئیے کہ خدا کیا کہتا ہے؟ فرماتا ہے:-
 وَمَا سَمِعْنَا بِأَنَّهُ سَمِعْنَا وَكَذَّبَ اللَّهُ سَمِعًا۔ اے مصطفیٰ جب
 تم نے پھینکا تو تم نے نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا۔

قرآن کے اس انداز بیان پر سردھننے کو ہی چاہئے کہ اقرار بھی
 ہے اور انکار بھی ہے۔ میرے پیارے! یہ بات یوں بھی کہی جاسکتی تھی
 کہ تم نے نہیں پھینکا اللہ نے پھینکا مگر ایسا نہیں ہے بلکہ تم نے نہیں پھینکا
 جب تم نے پھینکا۔ واہ واہ پھینکے کا اقرار بھی ہے اور پھر اسی کا انکار بھی۔

حضرات! یہی ہے قرآن کا وہ انداز فصاحت و بلاغت جس کے ساتھ
 عرب کے بڑے بڑے نامور اور شہرہ آفاق شعرا و ادبا نے گھٹنے ٹیک
 دیئے اور قرآن کے ایک ایک آیت پر سجدہ نیاز کیا ہے۔ غور فرمائیے
 اگر اس آیت میں مثبت کی قید نہ لگائی جاتی بس اتنا ہی کہہ دیا جاتا کہ تم نے
 نہیں پھینکا اللہ نے پھینکا، تو انداز بیان میں اتنا وزن نہ پیدا ہوتا جتنا

اس میں ہے کہ تم نے نہیں پھینکا جب تم نے پھینکا۔

قرآن کا انداز بیان دیکھنے کے بعد جی یہ چاہتا ہے کہ ایک ایک نقطہ پر قاشہائے جگر کو قربان کر دیا جائے۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ قرآن کا کہے پر دے سے ٹکرا کر دلوں میں گھر بنانا چلا جاتا ہے۔

بہر حال کہنا یہی ہے کہ پھینکنا مصطفیٰ کا: بتانا خدا کا ہے، نام اسی

کا قرآن ہے۔

حضرات! اگر میں تفصیل میں آگیا تو اندیشہ ہے کہیں تمہیں ہی خود مستقل ایک موضوع نہ بن جائے بس ایک مثال اور دے کر سلسلہ تمہید کو ختم کر کے اصل موضوع "سراج منیر" پر آجاؤں گا۔

آپ غور فرمائیں کہ سورہ والضحیٰ کی شان نزول کیا ہے؟

حضرات! کافروں نے چند سوالات سرکاسے سے کئے تھے۔ سید عالم

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا معمول گرامی یہ تھا یا تو فوراً رحبتہ جواب عطا

فرماتے۔ یا فرماتے انشاء اللہ تبارک وتعالیٰ جواب دوں گا۔ آج آپ نے

انشاء اللہ نہ فرمایا۔ مفسرین کا کہنا ہے کہ نزول وحی کا سلسلہ بند رہا۔ تین

دن گیا وہ دن، ام دن، ام دن علی اختلاف الروایت۔

اب اس درمیان میں کافروں نے جواب کا شدت سے مطالبہ

شروع کیا۔ آخر ظالموں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

کے ذب نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو چھڑ دیا۔ اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)

کا رب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ناراض ہو گیا ہے۔ یہ سننے کی آواز

دو عالم کا چہرہ اتر گیا جیسے ہی سرکار کا چہرہ اتر اویسے ہی رحمت باری

جھوٹی۔ جبریل کو یہ حکم ہوا کہ جاؤ میرا پیغام میرے محبوب تک پہنچاؤ چنانچہ

حضرت جبریل امین سورہ والضحیٰ لے کر بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئے۔

والضحیٰ واللہ اذ ابھی ما وحقک ربک وما حقک۔

یعنی نہ تو تمہارے رب نے تم کو چھوڑا اور نہ ہی تم سے ناراض ہوا۔
کافروں نے یہی تو کہا تھا کہ محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کا رب
محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ناراض ہو گیا۔ اللہ جلے اسی پر "ما نفی" داخل
فرمادیا یعنی نہ تو تمہارے خدا نے تم کو چھوڑا اور نہ ہی تم سے ناراض ہوا۔

ایک نکتہ :- حضرات! یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ رب تبارک و تعالیٰ کو تو یہی کہنا تھا کہ تمہارے رب نے نہ تو تم کو چھوڑا اور نہ تم سے ناراض ہوا۔ تو پھر سوزہ کا ابدی عین کیسے ہوئی جا رہی ہے "والضحیٰ واللیل اذا ہی" کیوں کہا گیا :- ۲

حضرات! نزولِ قرآن میں مزاج انسانی کی بھرپور رعایت کی گئی ہے۔ آپ اسے اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایک شہرہ آفاق خطیب جب قوم کو خطاب کرتا ہے تو پہلے اصل مضمون نہیں بیان کرتا بلکہ اسکی تمہید اٹھاتا ہے تاکہ آنے والے مضمون کو قبول کر سکنے کے لئے ذہن سنجیدہ آمادہ و تیار ہو جائے۔ ایسے ہی اپنے وقت کا نامور ادیب و قلم کار جب کسی مضمون کو احاطہ تحریر میں لانا چاہتا ہے تو پہلے اصل مضمون ہی کو نہیں لکھتا بلکہ اس کا دیباچہ سنوانا ہے تاکہ مضمون اچھی طرح ذہن نشین ہو سکے پس اسی طرح خدا نے قدیر کو یہی فرمانا ہے کہ تمہارے رب نے نہ تم کو چھوڑا اور نہ تم سے ناراض ہوا۔ مگر "والضحیٰ واللیل اذا ہی" اصل مضمون کی بہت ہی ادنیٰ اور بڑی پیاری تمہید ہے۔ گویا اصل مضمون سے پہلے خدا قسم یاد فرماتا ہے۔ یعنی مصطفیٰ تمہارے رنجِ زیبا کی قسم اور زلفِ مغبر کی قسم، یعنی اس رنجِ زیبا کی قسم جسے تم بے نقاب کر دو تو زمانہ روشن ہو جائے۔ اور اس زلفِ پیچا کی قسم جسے تم بچکر دو تو زمانہ تاریک ہو جائے، نہ تو تمہارے رب نے تم کو چھوڑا اور نہ تم سے ناراض ہوا۔ گویا

رات و دن دونوں تمہاری بارگاہ کے بھکاری ہیں، دن اپنی روشنی اور اجالے کے لئے تمہارے روئے تاباں کا محتاج ہے اور رات اپنی تاریکی و گیسو درازی میں تمہاری زلف پیچاں کی نیاں بند ہے۔

یہ تہید اتنی پیاری اور اونچی ہے کہ اس کو سننے ہی خود لوگوں کو یقین ہو گیا کہ جو خدا ان کے چہرے اور زلفوں کی قسم یاد فرمائے وہ بھلا ان کو چھوڑ کیسے سکتا ہے؟ اور ناراض کیونکر ہو سکتا ہے۔

اب پھر اصل موضوع سے وابستہ ہو جائیے۔ ہم اور آپ کہیں یہ سورہ واضح ہے، لیکن سورہ واضحی سے پوچھئے کہ تو کیا ہے؟ تو اس کا کہنا ہے کہ میں تو مصطفیٰ کے اترے ہوئے چہرہ کی شادابی لانے والی ہوں، ان کے شکستہ خاطر پر مسد کھنے آئی ہوں، ان کے قلبِ حزیں پر طابیت و سکون کا شبنم چھڑکے آئی ہوں۔

حضرات! پتہ چل گیا اب ہمہ دنیا کے قرآن، اور وہی قرآن کے میں تو بیانِ ادا ہوں محمد رسول اللہ کا۔ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔

فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ

سِرِّ جَانِبِیْرَا

حضرات! میں نے عرض کیا کہ قرآن سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اداؤں کے بیان کا نام ہے۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہے چہرہ رسول کا بتائے خدا اور نام اسی کا قرآن۔

حضرات! سراج کے معنی آفتاب اور چراغ، دونوں کے ہیں۔ پروردگار اپنے محبوب کو چمکنا سورج اور روشن چراغ فرما رہا ہے۔ اب دیکھنا اور غور کرنا یہ ہے کہ آفتاب کی وہ کونسی خصوصیات ہیں جس میں مصطفیٰ کے چہرے کو ان سے مماثلت و مشابہت ہے۔

(۱)

حضرات! جس طرح آسمان کا آفتاب طلوع ہوتا ہے تو وہ اوج
نہج، امیر غریب، راجہ پر جا، حاکم محکوم، راغی و رعایا، آقا و غلام، چھوٹا بڑا،
نالا گورا اور سفید و سیاہ کو اپنی روشنی دینے میں فرق و امتیاز نہیں کرتا۔ وہ
یکساں طور پر سب کو اپنی کمال فیاضی سے معمور و منور کرنا چاہتا ہے، وہ راجہ
کے سر بفلک محل اور غریب کی پھوس کی شکستہ جھونپڑی میں کوئی خط امتیاز
نہیں کھینچتا، اس کے مزاج و فطرت میں ہے کہ وہ یکساں طور پر سب کو اپنی
ضیاء بخشیدنے سے مالا مال کرے۔

بس ایسے ہی میرے سرکار بھی، آسمان نبوت کے آفتاب ہیں وہ اپنی
ہدایت کی کرنوں کے بجھنے میں سبکی، بدلی، ترکی، مصری، ہندی، سندھی،
یونانی اور افغانی میں کوئی خط امتیاز نہیں کھینچتے۔ وہ یکساں طور پر ہر ایک کو
آفتاب ہدایت سے روشنی و درخشندگی بخش رہے ہیں۔

(۲)

میرے سرکار! آفتاب بھی ہیں اور چراغ بھی بعض خصوصیات
ایسی ہیں جو آفتاب میں ہیں لیکن چراغ میں نہیں، کچھ خوبی چراغ میں ہے آفتاب
میں نہیں، مگر میرے سرکار میں دونوں کی خصوصیات جمع ہیں۔
مثلاً آفتاب سے کوئی دوسرا آفتاب روشن نہیں ہو سکتا مگر ایک
چراغ سے بے شمار چراغ روشن ہو سکتے ہیں۔

(۳)

حضرات! اس کو سمجھنے کے لئے ایک ضابطے کو سمجھنا ضروری ہے۔
دیکھئے! اشیٰ ایک ہوتی ہے مگر جگہ کے بدل جانے سے نام بدل جاتا ہے مثلاً
ہم ساحل سمندر پر آئے اس کی اٹھتی موجوں کو، پھر اس کی بھیجی ہوئی سفید
اور طویل و عریض چادر کو دیکھا تو یہی کہا کہ یہ پانی ہے۔ لیکن سورج کی گرم

شعاعوں نے، اتنی حرارت دگری پیدا کی کہ یہی پانی دھوئیں کی طرح ہواؤں میں اڑنا نظر آیا، جب ہم نے اسے اڑتے ہوئے دیکھا تو کہا یہ بھاپ ہے اور اسی بھاپ نے اوپر جا کر جب اپنی قرار گاہ بنالیا تو اب ہم نے بدلی کہا۔ پھر ہوا میں چلیں تو بدلیوں میں ٹکراؤ ہوا جس کے نتیجے میں ہلکی ہلکی بوندیں گریں ہم نے کہا دیکھو یہ ترش ہو رہا ہے۔ رَم جہم، رَم جہم بارش ہو رہی ہے پھر اس میں شدت ہوئی تو ہم نے کہا موسلا دھار بارش ہو رہی ہے پھر یہی پانی سطح زمین پر پہننے لگا تو آپ نے کہا کہ یہ پانی ہے۔ چند نالیاں آپس میں مل گئیں تو آپ نے کہا کہ نالہ ہے، کچھ نالے بکے بعد دیکھو ایک دوسرے سے ملنے لگے تو آپ نے کہا کہ یہ ندی ہے، پھر ندیاں آپس میں ملتی گئیں تو آپ نے کہا کہ یہ دریا ہے گنگا و جمنابے۔ پھر سی دریا آخر میں خلیج بنگال ہوتے ہوئے سمندر کی آغوش میں آگیا تو آپ نے اسے سمندر کہا حضرات! پانی ایک ہے لیکن جگہ بدلتی جا رہی ہے۔ آپ نام بدلتے جا رہے ہیں اسی ایک پانی کو کبھی آپ نے بھاپ کہا، پھر اسے بدلی اور بادل کہا، پھر اسی کو ترش اور موسلا دھار بارش کہا، پھر اسی کو نالی کہا، پھر اسی کو نالہ کہا، پھر ندی کہا پھر اسے دریا کہا اور آخر میں پھر اسے سمندر کہا۔

بس اب اسے ہی مرکزِ نورِ مصطفیٰ ہے مگر یہی روشنی ابوبکر کے پاس آئی تو بیکرِ صداقت کہا، اور وہی روشنی فاروقِ اعظم کو ملی تو بیکرِ عدالت کہا اور وہی روشنی عثمانِ غنی کو ملی تو بیکرِ سخاوت کہا، وہی روشنی علی مرتضیٰ کو ملی تو بیکرِ شجاعت کہا۔ بس اب اسے ہی منتقل ہوتے ہوئے نہ جانے کتنے چراغ روشن کرتی گئی۔

اسی کو قرآن نے کہا ہے مصطفیٰ تم چمکے سورج ہو اور روشن چراغ۔

(۴)

حضرات! آپ یہ سوچتے ہو کہ اگر کوئی روشنی تو ایک ہی ہے مگر یہ
 الگ الگ جلائے کیسے؟ کوئی حدیں اکبرین کر چکا، کوئی فادہ حق ہو کر اجرا
 کوئی غنی ہو کر آسودہ ہوا، کوئی ولی و شیخ ہوا۔
 حضرات! آپ دور نہ جائیے، ابھی ہندال میں دیکھئے یہ روشنی کی
 جہالیں ٹلک رہی ہیں اور یہ راڈ بھی لگے ہیں مگر کوئی سرخ ہے، کوئی سبز
 کسی رنگ بیلائے، کسی کا اُجلا، کسی کا نیلا تو پچ پچ بتائیے کیا اسے بادشاہ
 سے الگ الگ رنگ کی روشنی مل رہی ہے۔ جواب یقیناً نفی میں ہوگا۔
 یعنی مرکز ایک ہی طرح کی روشنی سے رہا ہے مگر شیشے کا رنگ بدلتا
 جا رہا ہے تو روشنی بھی بدلتی جا رہی ہے۔

بس ایسے ہی مرکز نور مصطفیٰ ہے

دل بھی کچھ ایسا ہی ہے روشنی نہیں بدلتی بلکہ دل کا فانوس بدلتا
 جا رہا ہے جس کا جیسا دل تھا ویسی ہی روشنی بھی نمودار ہوئی کہیں صداقت
 کی روشنی پھیلی، کہیں عدالت کی، کہیں سخاوت کی، کہیں شجاعت کی۔
 اسی لئے قرآن میرے سرکار کو فرماتا ہے "سراجا قنیرا" یعنی مصطفیٰ تم
 آفتاب ہی ہو اور روشنی چراغ بھی۔

یہ وہ مثال ہے کہ ایک چراغ سے بہت سے چراغ روشن ہوتے

(۵)

ایک سوال و اس کا جواب: جب ملائے ا یہ بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ
 نے سب سے پہلے میرے سرکار کو اپنے ہی نور سے پیدا فرمایا تو بعض عقل کے
 اندھے اس پر استحالہ پیش کرتے ہوئے اعتراض کہتے ہیں کہ پھر تو اللہ
 کے نور کا کوئی حصہ کوئی جزو کٹ کر علیحدہ ہو کر اس میں آیا ہو گا معاذ اللہ

حضرات دنیاوی مثال سے اس کا ایک جواب یہ بھی ہے کہ جب ایک چراغ سے ہزاروں چراغ روشن کئے جا رہے ہیں تو کیا ہر سرچراغ میں اور الگ الگ چراغ کا حرکت کر اس میں چلا آتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو پہلے چراغوں کے جلنے کے بعد پہلے چراغ کو بالکل ختم ہو جانا چاہئے۔ اگر ایک چراغ کو دوسرے چراغ سے سرسوں کے دانے سے بھی کم تر حرکت کر بل رہا ہو تو ہر دو چار سو چراغ تک پہنچے پہنچے پہلے کو ختم ہی ہو جانا چاہئے مگر ایسا نہیں ہے۔ تیل ہی درست رکھئے اور بسے شمار چراغ پہلے چراغ سے روشن کیے تو اس میں کوئی فرق نہ آئے گا۔ یہ جوں کا توں علی حالہ باقی رہے گا۔

جب ایک نادری نور کا یہ حال ہے تو اس نور حقیقی و نور الہی کا کیا حال ہوگا۔ فالحمد للہ علی ذالک۔

(۱۴)

حضرات! ابھی گفتگو یہ چل رہی ہے کہ سرکارِ روشن چراغ ہیں اس سلسلے میں ایک تاریخی واقعہ یاد کیجئے۔

ایک بار آقائے دو جہاں کسی سفر میں ہیں صحابہ کرام بھی شریک سفر ہیں۔ اللہ کے رسول نے ایک ایسی جگہ پر آؤ ڈالا جہاں پانی کا کوئی چشمہ یا کنواں وغیرہ کچھ نہ تھا۔ اور اب قافلہ میں پانی بالکل ختم ہو چکا ہے صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ! اب ہمارے پاس پانی کی بوند تک نہیں۔ سرکار نے ارشاد فرمایا، ایسا کرو اس پہاڑی کو پھانڈ کر ادھر جاؤ۔ ایک کالا کلوٹا، جشی غلام اونٹ پر پانی کا مشکیزہ لے کر جا رہا ہے۔ اسے میرے پاس بلا لاؤ۔ میں پانی کا نظم کر دوں۔

حکم پانے ہی صحابہ آگے بڑھے دیکھا تو سچ پچ ایک جشی غلام اونٹ پر پانی کا مشکیزہ لے کر جا رہا ہے۔

منوٹ:۔ ایک لمحہ کے لئے پھر رک جائیے۔ اگر صحابہ کرام رضی اللہ

عنہم رسول اللہ کے لئے علم خیب کے قائل نہ تھے، تو انہیں سوال کرنا چاہئے تھا کہ یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) اتنا بڑا پہاڑ نظروں کے سامنے حائل ہے آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ ایک کالا کلوتا غلام، اونٹ پر پانی کا مشکیزہ لئے جا رہا ہے، سوال نہ کرنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ صحابہ کرام کا عقیدہ تھا، سرکار عالم خیب ہیں۔ پھر جانے والے کی کوئی دھندلی تصویر نہیں بلکہ اس تفصیل کے ساتھ کہ کالا کلوتا، جشی غلام، اونٹ، مشکیزہ پانی سے بھرا ہوا۔ اللہ اکبر! گو یا وہ آنکھوں کے سامنے کھڑا ہے۔ اور سرکار دیکھتے جا رہے ہیں اور بتاتے جا رہے ہیں۔

نکتہ: رنگ کا دیکھنا کہ کالا کلوتا ہے، اونٹ کا دیکھنا یہ کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ تو آنکھ والے کا کام ہے۔

ہر حال اتنا تو تم نے مانا کہ جہاں تم نہیں دیکھتے، وہاں سرکار دیکھتے ہیں۔ مگر یہ تو بتاؤ یہ معلوم کر لینا کہ یہ غلام ہے کیا یہ بھی آنکھ ہی کا کام ہے یہ کیسے پتہ چلا کہ یہ غلام ہے؟

شاید کہ تم یہ کہو یہ ان کا لباس تھا۔ تو پھر مجھے کہہ لینے دو جن کا لباس اتنا صحیح ہوتا ہوا ان کے علم کی صحت و یقین کا کیا حال ہو گا۔ فاعلم شرعی ذالک۔

حضرات! پھر وہیں آجائیے! کہ صیبا پہنچے دیکھا کالا کلوتا، جشی غلام، اونٹ پر پانی کا مشکیزہ لئے جا رہا ہے۔ چنانچہ صیبا نے عرض کیا میرے آقا نے تم کو بلا یا ہے تم وہاں چلو۔ غلام نے جواب دیا تمہارا آقا وہ ہے جس نے تمہیں میرے پاس بھیجا ہے اور میرا آقا وہ ہے جس نے مجھے پانی لانے کے لئے بھیجا ہے مگر جب صیبا کرام نے سمجھانے کی طرح سمجھایا تو وہ غلام راضی ہو گیا اور آقائے کائنات کی بارگاہ میں حاضری

دی۔ سرکار نے فرمایا ہمارے قافلے کا پانی ختم ہو گیا ہے۔ زیادہ نہیں صرف ایک پیالہ پانی دیدو۔ چنانچہ اس نے ایک پیالہ پانی دیدیا۔ اب سرکار کا اعجاز یہاں سے رنگ لاتا ہے۔ پورے قافلے کو حکم دیدیا۔ میراب ہو جاؤ پورے قافلہ نے پانی پیا، اونٹوں نے بھی پانی پیا، نہانے والے ہندے وضو کرنے والوں نے وضو کیا۔ عرض کہ جسے جس طرح استعمال کرنا تھا ویسے استعمال کیا اور یہ غلام سب دیکھتا جا رہا ہے کہ میں نے تو ایک ہی پیالہ پانی کا دیا تھا یہ سب کے سب کیسے میراب ہو رہے ہیں؟۔

اچانک پیالہ کے قریب آیا تو کیا دیکھا کہ پیالہ جوں کا توں پانی سے بھرا ہوا ہے۔ گویا کہ اس سے ایک قطرہ نہیں لیا گیا ہے۔ یکا یک غلام کو پیالے میں اپنی تصویر نظر آئی تو کیا دیکھا کہ جب لمحوں کی صحبت نے اسے گورا چٹا بنا دیا۔ اب دل کا دروازہ کھل گیا۔ اور عرض کیا کہ میں شرف بہ اسلام ہونا چاہتا ہوں۔ سرکار نے کلمہ پڑھا کر مسلمان بنالیا۔ اور اب خود سرکار ہی نے ارشاد فرمایا تم اپنے آقا کے پاس واپس جاؤ۔

یہ غلام عرض کرتا ہے سرکار! اب تو زندگی کا چین و سکون آپ کے قدموں میں ہے اپنے قدموں سے دور نہ کیجئے۔ اس نے ہر جہت اصرار کیا مگر عالم غیب نبی نے اسے واپس کر دیا۔

چنانچہ اب وہ پانی کا مشکیزہ لے کر اپنے آقا کے دروازہ پر آگیا۔ آقا باہر آیا۔ اس نے پوچھا تم کون ہو؟ جواب دیا میں آپ کا غلام ہوں۔ آقا نے کہا ہرگز نہیں۔ تم میرے کیسے غلام ہو سکتے ہو۔ اس نے کہا اگر مجھے نہیں پہچانتے تو اونٹ ہی پہچان لیجئے، مشکیزہ پہچانئے اور یہ چابی کا چھلا پہچانئے۔

الک نے پوچھا آخر یہ انقلاب کیسا؟ گئے حقے کالے کلوٹے

ہو کر۔ اور لوٹے ہو تو گورے چٹے ہو کر۔ غلام نے کہا، جب گیا تھا تو آپ کا غلام تھا اور اب لوٹا ہوں تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام ہو کر آیا ہوں۔ آقا کی بدل گئی تو رنگ و روپ بھی بدل گیا؟

یہ سننے ہی مالک کے دل میں لپک بیدار ہوئی اور گویا ہوا میں مجھے بھی لے چلو۔ اس نے کہا اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے؟ میں تو یہی چاہتا ہوں کہ انہیں کے قدموں میں باسیرا ڈال دیا جائے۔ اب دونوں چلے۔ آقا پیچھے ہونے لگا تو غلام نے کہا آپ آگے چلے۔ کیونکہ میں غلام ہوں اور آپ آقا ہیں۔

مالک نے کہا تم غلام نہیں آقا ہو۔ جو محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا غلام ہو جاتا ہے تو پھر وہ تم جیسوں کا آقا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ غلام آگے آگے اور مالک پیچھے پیچھے جا رہا ہے۔ درخواں رہے سرکار کی غلامی۔

بہر حال اب یہ دونوں سرکار کی بارگاہ میں پہنچے۔ غلام کے آقا نے جیسے ہی سرکار کی موسیقی صمدیت دیکھی، چہرے پر سحرانہ جاہ و جلال اور رسالت و نبوت کا ہم خم دیکھا، اللہ ہو گیا اور قدموں میں پھوٹ گیا۔ عرض کیا سلطان ہونا چاہتا ہوں۔ سرکار نے کلمہ پڑھا یا، وہ شرف بہ اسلام ہوا۔

یہ حبشی سرکار کی بارگاہ میں ٹھہرنا چاہتا تھا مگر سرکار نے نکتہ یہ: واپس کر دیا۔ اس کی مصلحتیں ملاحظہ فرمائیے۔

اگر سرکار اسے روک لیتے تو لوگ سیرت نبوی پر دھول اڑاتے اور یہ کہتے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم دوسروں کے غلاموں کو کلمہ پڑھا کر اپنے پاس روک لیتے ہیں۔ اس سے سیرت مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر داغ و دھبہ آنے کا اندیشہ تھا۔

(۸)

دوسری بات یہ تھی کہ میرے سرکار کو معلوم تھا کہ اگر یہ یہیں رہ گیا تو یہاں بہت سے چراغ ہیں۔ البتہ یہ جہاں جائے گا اس چراغ سے دوسرے چراغ بھی روشن ہوں گے۔ اس لئے سرکار نے اسے واپس کر دیا۔ قرآن نے ایسے ہی چہرے مہرے والے کو "سراجا منیر" کہا مصطفیٰؐ تم جیسے سورج ہو، روشن چراغ ہو۔

(۹)

حضرات! اس مثال سے دعا ایک گوشے اور سماعت فرمائیے۔ جب مالک نے اپنے غلام سے کہا "آب تم میرے آقا میں تمہارا غلام" تم آگے چلو میں پیچھے۔

ایک بار میں تصوف کی کسی کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا تو ایک بات نظر سے گذری۔ اسے جی لگا کر سماعت فرمائیے۔

ایک صاحب دل درویش بڑے مکان کے حاشیے پر کھڑے تھے اچانک ادھر سے کتوں کو گرفتار کرنے والی گاڑی گذری۔ کارپوریشن اور میونسپل بورڈ کی طرف سے کہہ لیا انتظام رہتا ہے کہ جب شہر میں کتے زیادہ ہو جاتے ہیں تو کتوں کی گرفتاری عمل میں لائی جاتی ہے۔ اس گاڑی کو کوئی پہچانے یا نہ پہچانے مگر کتے بہت اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ اس لئے شور مچاتے چلتے ہیں۔ شاید کہ وہ اپنا برادری کو اپنی آواز سے خبردار کرتے ہوں۔ بھاگو، گھسکو، گرفتاری آئی۔ مگر وہی کتے گرفتار کے کھاتے ہیں جس کے گلے میں پتہ نہیں ہوتا۔

بہر حال! جب یہ گاڑی درویش کے قریب سے گذری تو ایک بال دار کتے نے اپنے گلے کو جھٹکا دیا تو اس سے اس کا پتہ نظر آگیا۔ پتہ دیکھتے ہی گرفتار کرنے والے نے کہا اسے یہ تو کسی کا پالتو

معلوم ہوتا ہے۔ پس یہ کہہ کر اس نے دروازہ کھولا اور اس کتے کو آزاد کر دیا۔ شرک کے حاشیہ پر صاحبِ دل درویش جو کھڑے تھے ان پر کیفیت طاری ہو گئی۔ اور زمین پر گر پڑے۔ معتقدین نے اٹھایا اور جب وہ ہوش میں آئے تو لوگوں نے کہا کہ یہ کونسا ایسا جملہ تھا، جسے سن کر آپ کو حال آگیا۔؟

فرمایا تمہارے جیسے سنگتوں کے لئے صرف ایک جملہ تھا مگر میرے لئے وہ تیر و شتر تھا۔ فرمایا اس بال دار کتے کو، ان لوگوں نے یہ سمجھ کر غار کر لیا تھا کہ آوارہ ہے، کسی کا پالتو نہیں ہے، یعنی اس کا کوئی مالک نہیں ہے۔ مگر جب پٹ نظر آیا تو یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ اسے یہ تو کسی کا پالتو معلوم ہوتا ہے۔

پس میں نے بھی سوچا کہ اگر کل میدانِ قیامت میں ہمارے گلے میں سرکارِ دو جہاں کی غلامی کا پٹ ہو گا تو فرشتے یہ کہہ کر رہا کر دیں گے اسے یہ تو شفیعِ عشر کا غلام معلوم ہوتا ہے۔

دوستو! ہم نے تم نے اس غلامی کی قدر و قیمت نہ جانا۔ آج جس ہلکے دور سے مسلمان گذر رہا ہے اگر وہ اس گمراہ کو سمجھ لے تو ہر عیب و عیبت، ہر بلا، ہر گرفت سے رہائی پا جائے۔ رہائی کا راز یہ ہے کہ غلامی میں ضروری شے ہے، اور صحیح معنوں میں اگر ہم اور آپ ان کے غلام ہو جائیں تو کوئی ہمارا بال بچہ کا نہیں کر سکتا۔ یہ عیب و عیبتوں کے جو پہاڑ توڑے جا رہے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ ہمارے بارے میں سمجھ رہے ہیں کہ انبیاءِ مہنام کے مسلمان ہیں کام کے نہیں ہے اسلامی روح نکل چکی ہے۔ کائنات ہم صحیح معنوں میں ان کے غلام ہو جاتے

آج بھی جو براہِ راست مسلمان پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

حضرات! اس واقعہ میں آپ نے یہ بھی سنا کہ غلام ایک پیالہ پانی
دینے کے بعد جب رسول کر دگار کے قریب آیا تو کیا دیکھا؟ اب کالا کلوٹا نہیں
بالکل گورا چٹا ہو گیا ہے۔

معلوم ہوا میرے سرکار سراج منیر ہیں لیکن آسمان کے آفتاب اور
آفتاب نبوت میں فرق یہ ہے کہ آسمان کا آفتاب صرف ظاہر اور ادہری سطح کو
چمکاتا ہے اور آفتاب نبوت باطن کو بھی چمکاتا ہے۔ آفتاب جب طلوع ہوتا
ہے تو زمین کی اوپری سطح چمک جاتی ہے، کچھ ریل کا ظاہر چمک رہا مگر باطن نہیں
چمکے گا۔ مگر میرے سرکار ایسے آفتاب ہیں جو ظاہر و باطن دونوں کو چمکاتے
ہیں۔ اعلیٰ حضرت نے اسی حقیقت کی طرف نشاندہی کرتے ہوئے تمنا کی ہے
چمک تجھ سے پاتے ہیں سب پائے والے

مراد دل بھی چمکا دے چمکائے والے

اس لئے پروردگار عالم فرماتا ہے پیارے! تم چمکے سورج اور روشن
جولج ہو۔

نکتہ

حضرات! یہاں پر ایک نکتہ اور بھی ملاحظہ فرمائیے۔
ابھی میں نے عرض کیا کہ سرکار ایسے آفتاب ہیں کہ ظاہر و باطن دونوں کو
چمکاتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو حدیث گلابی میں خاندقا میں نہ ہوتی۔
خاندقا میں اسی کا منظر ہے کہ یہاں باطن کو چمکایا جاتا ہے۔

حضرات! میں کہنا بہ چاہتا ہوں کہ سرکار ایسے ظاہر و باطن دونوں
کو چمکایا مگر اب مجھے یہاں عرض کرنے دیجئے کہ باطن کو چمکانا اور ہے
اور باطن سے چمکانا اور ہے۔ اب تک تو آپ نے یہ سمجھا کہ باطن کو بھی
چمکایا اب باطن سے چمکانا ملاحظہ فرمائیے۔

جلال الدین اکبر کا دور تھا۔ ایک روز وہ اپنے کمرے میں آیا

اتفاقاً شمعیں سب بجھ گئیں۔ کمرے کی تاریکی برداشت نہ کر سکا، دل گھبرا یا، الجھن بڑھی، چہرے پر ایک رنگ آیا ایک رنگ گیا، حتیٰ کہ دل کی گھبراہٹ تیز سے تیز تر ہو گئی۔ مصاحبین سب اکٹھے ہو گئے۔ پوچھا کیا حال ہے؟ اس نے کہا کہ دل کمرے کی تاریکی برداشت نہ کر سکا۔ فوراً قبر یاد آئی سو چاہا جب اس کمرے کی تاریکی برداشت نہ کر سکا جسہیں اٹھتا بیٹھتا، لیٹا اور سوتا ہوں اس سے دل بھی مالتوس ہے مگر اس قبر کی تاریکی کا کیا عالم ہو گا جہاں نہ کوئی مونس نہ غم خوار نہ چراغ نہ دیا، گھٹا ٹوپ تاریکی اس لئے اختلاج ہوا۔ لوگ سمجھاتے رہے جواب دیئے رہے مگر کسی طرح دل کو تسلی نہ ہوئی، اتفاق سے بیربل آگیا اس لئے بھی یہی سوال کیا بادشاہ نے وہی جواب دیا جو سب کو دے چکا تھا۔

بیربل نے عرض کیا، بادشاہ سلامت! ایک بات ارشاد فرمائیں آپ جس پیغمبر پر ایمان لائے ہیں ان کا آفتاب نبوت اس روئے زمین پر کتنے برسوں چمکا اور روشن رہا۔؟

اکبر نے جواب دیا۔ ۲۳ برس، ۱۴ برس مکی زندگی اور۔ ابراہیم مدنی زندگی۔ بیربل نے کہا جب آپ کے نبی کا آفتاب نبوت صرف ۲۳ برس زمین کے اوپر چمکا اس کا حال یہ ہے کہ اس کے نور اور روشنی سے پوری دنیا چمک اٹھی، زمین کے گوشے گوشے میں اس کی روشنی پہنچ گئی۔ اور اب تو وہ آفتاب نبوت کئی صدی سے زمین کے نیچے آرام فرما رہا ہے تو کیا زمین کے پچھلے خطے کو نہ چمکایا ہو گا۔

اس نے حضور! قبر کی تاریکی سے وہ ڈبے حسمان کا دامن نہ تھا ماہو۔ آپ کیوں ڈرے۔ جب کہ آپ کے ہاتھ میں اسی آفتاب نبوت کا دامن ہے۔

بریں نازم کہ ہستم امدت تو لگا ہے بارمول اللہ لگا ہے

ایسے ہی چہرے ہرے والے کو خدا فرماتا ہے ودا عبا الی
 اللہ باذنہ وسرا جاقبیرا۔ مصطفیٰ تم چکے سورج ہو اور روشن
 چراغ۔ ۵

تم جو دہویں کے چاند ہو تم آفتاب ہو
 جو کچھ بھی ہو خدا کی قسم لا جواب ہو

نکتہ (۹) :- حضرات! شاید کسی کو شبہ پیدا ہو کہ اب تو وہ نہ ہے
 پھر روشنی پھیلانے کا کیا سوال؟

لہذا یہ نوٹ کر لیجئے کہ آج آپ کو یہی سنتا ہے اور میرا موضوع
 بھی یہی ہے کہ آسمان آفتاب سے آفتاب نبوت کو کتنی وجہ سے مشابہت
 و مماثلت ہے۔ چنانچہ اس میں ایک یہ بھی ہے کہ آسمان کا آفتاب
 غروب ہونے کے بعد معدوم و مٹ نہیں جاتا بلکہ چھپ جاتا ہے۔

اسی لئے سرکارِ اعلیٰ حضرت امامِ اہلسنت فرماتے ہیں :-
 تو زندہ ہے وائے تو زندہ ہے وائے

میرے چشمِ عالم سے چھپ جانے والے

اسی لئے خدا کے ذوالجلال نے سراجا منیرؐ فرمایا۔ اے
 مصطفیٰ تم چکے سورج اور روشن چراغ ہو۔

(۱۰)

حضرات! آفتاب سے مماثلت کی وجہ سے حضرت فرمائیے آفتاب

جب ڈوب رہا ہو تو اس وقت اسے دیکھئے۔ ایسا معلوم ہو گا کہ آسمان
 کے حاشیے پر سونے یا پتیل کی تھالی چمک رہی ہے لیکن آپ کو معلوم ہونا
 چاہئے کہ جو آفتاب بظاہر دیکھنے میں پتیل کی تھالی معلوم ہو رہا ہے اس
 کے بارے میں فلاسفہ کا کہنا ہے کہ وہ پورے کرۂ ارض اور دسے زمین

سے سوا تیرہ لاکھ گنا بڑا ہے۔

حضرات! یہ سورج پہلے آسمان کا سیارہ نہیں بلکہ چوتھے آسمان کا سیارہ ہے اس لئے آپ کو تعجب نہیں ہونا چاہئے۔ زمین سے پہلے آسمان کی بلندی، پھر پہلے آسمان کی موٹائی اور اس کا حجم، پھر ایسے ہی پہلے آسمان سے دوسرے، دوسرے سے پھر تیسرے، پھر چوتھے آسمان کی دوری و موٹائی اندازہ لگائیں کہاں یہ زمین کہاں چوتھا آسمان جسے دیکھ کر تو آنکھ لے کہا کہ پتیل کی تھالی۔ مگر فلاسفہ نے کہا روئے زمین سے سوا تیرہ لاکھ گنا بڑا سمجھ میں آگیا کہ جس طرح یہ آسمان کا آفتاب دیکھنے میں چھوٹا معلوم ہوتا ہے مگر کرہ ارض کو آفتاب سے کوئی نسبت نہیں۔

بس ایسے ہی مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم آسمان نبوت کے آفتاب ہیں دیکھنے میں بظاہر بشر معلوم ہوتے ہیں مگر پورے عالم بشر کو آفتاب نبوت سے کوئی نسبت نہیں۔ اسی لئے خدا فرماتا ہے مصطفیٰ تم چمکے سورج اور روشن چراغ ہو۔

(۱۱)

حضرات! آفتاب سے ایک مناسبت اور بھی ملاحظہ فرمائیے، ابھی میں نے عرض کیا کہ جب آفتاب ڈوب رہا ہو تو اسے دیکھئے ایسا معلوم ہوگا کہ جیسے پتیل کی تھالی، مگر یہ بتائیے کہ ٹھیک بار بجے دوپہر میں بھی آپ آفتاب سے آنکھیں ملا سکتے ہیں۔؟ آنکھیں خیرہ اور چکا چوند ہو جائیں گی۔

معلوم ہوا جب آسمانی آفتاب بالکل سر پہ ہو تو کوئی اس سے آنکھ ملا کر دیکھ نہیں سکتا۔ بس ایسے ہی میرے سرکار آسمان نبوت کے آفتاب ہیں۔ آفتاب کی طرح اگر وہ بے نقاب ہو جائیں تو پھر انھیں کون دیکھ سکتا ہے؟ اور پھر اس صورت میں بے عیوض ہونے کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ اس لئے خدا نے آفتاب نبوت کو لباس بشر میں بھیجا، تاکہ دنیاوی سے تریب

اگر فائدہ اٹھا سکے اور ہدایت پاسکے۔ اکیلے خدائے قدیر سراج نیر
 فرماتا ہے۔ مصطفیٰ تم چمکے۔ سورج اور روشن چراغ ہو۔

کہیں دور نہ جائیے افغانان نبوت ہی سے اس کی مثال دیے دیا ہوں۔ حضرات! سیدنا امام علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ساتویں پشت کے شاہزادے ہیں۔ جب ان کے روئے زیبا کی زیارت نہیں کر سکے تو بھلا کہیں میرے مصطفیٰ بے نقاب آجاتے تو کسی کی آنکھ ان کا جلوہ دیکھ سکتی؟

(۱۲)

حضرات! آفتاب سے ایک مناسبت اور ملاحظہ فرمائیے۔ اپنے کبھی اس کا تجربہ کیا ہو گا کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اگر آپ آفتاب کے سامنے منہ کر کے چلیں تو آپ کا سایہ پیچھے نظر آتا ہے پیچھے چلتا ہے گو یا اس میں اشارہ مل رہا ہے اگر تم آفتاب نبوت کی طرف بڑھو گے تو دنیا سایہ کی طرح تمہارے پیچھے پیچھے دوڑے گی۔ اور اگر کہیں تم نے آفتاب نبوت سے منہ موڑا تو دنیا کی تلائیں میں تم پیچھے پیچھے دوڑو گے۔ اور یہ دنیا تم سے آگے آگے بھاگے گی۔ اگر اس دنیا کو مسخر کرنا چاہتے ہو تو ان کی طرف چلو۔ یہی وہ وجہ ہیں کہ خدا اپنے محبوب کو سراج منیر فرماتا ہے، مصطفیٰ تم چمکے سورج اور روشن چلے ہو۔

(۱۳)

حضرات! آپ سوچتے ہوں گے کہ جب سرکار آفتاب بن کر آئے تھے تو ابو جہل و ابولہب کیوں نہ چمکے؟

حضرات! آفتاب کا کام تو چمکانا ہے مگر کوئی چمکنا بھی تو چاہیے۔ مثلاً بہت عرصہ ہوا میں نے پڑھا تھا کہ امریکہ میں سو سو منزل کی عمارت ہے اب آپ کسی کو اسی سو منزل والی عمارت کی آخری منزل کے گروں میں لے جائیے۔ اور اس وقت ٹھیک بارہ بجے کی دوپہر ہو مگر وہ شخص کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لے۔ تمام کھڑکیوں کو بند کر کے کالے پردے لٹکا دیں روزن دسوراج کو کپڑے سے بند کر دے تاکہ کسی طرف سے بھی روشنی آنے

کی گنجائش نہ رہ جائے، ان ہولناکیاں ہیں پورا امریکہ چمک رہا ہو گا، ذرہ ذرہ
 گلی گلی، کوچہ کوچہ روشن ہو گا اس کرے میں تاریکی و سیاہی ہو گی۔ اب اگر
 وہ شخص اپنی بد نصیبی کا ماتم کرے، یا آفتاب کا شکوہ کرے کہ دیکھو پورا
 امریکہ روشن ہے مگر میری گھر تاریک ہے۔ دنیا اس کی گوشمالی کرے گی
 نادان! تیری عقل پر پتھر پڑا ہے۔ اسے آفتاب کی کرنیں تو میرے کرے
 کی دلیز پر سر ہو چکی ہیں، اندر آنے کو وہ چل رہی ہیں تو دروازہ کھول
 دے۔

بسے بسے ہی آفتاب نبوت کی ضیاء باری و ضیاء پاشی تو عام ہے
 مگر ابو جہل و ابولہب نے دل کا دروازہ بند کر لیا تھا۔ یہی وہ مناسبت
 ہے جس سے قرآن سیراج منیر کہہ رہا ہے۔ مصطفیٰ تم چمکے سورج اور
 روشن چراغ ہو۔



سَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

اطَاعَتِ رَسُولُ

نَمُودَةُ وَفَصَلَّى عَلَى رَسُولِ الْكَرِيمِ

اَمَّا بَعْدُ

فَاعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

مَنْ يُطِيعِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا

(۲۲ پارہ ۶ رکوع)

ترجمہ!

جس نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی فرمانبرداری

کی اس نے بڑی کامیابی پائی۔

سُالِمُوا مِنْ سَخِي كَاتِحَا مِ لَوْ

کچھ نہ کچھ انعام ہو ہی جائے گا

یادِ ابرو کر کے تڑپو بلبلو

مکڑے مکڑے دام ہو ہی جائے گا

مُفْلِسُوْا اِنْ كُنْتُمْ فِيْ سَا بَرٍ وَّ

باغِ خلد اکرام ہو ہی جائے گا

راہِ حضرت

حضرات اہلسیرت نبوی کے چند گوشے آج میری تقریر کا عنوان ہیں جن میں خصوصیت سے اطاعتِ حاکم اور دینِ ستارہ اور قانون کی جامعیت پر بحث کی گئی ہے۔ یہ ایک ایسا مبسوط و مفصل مضمون ہے جس کے لئے ہزار صفحات اور کئی راہیں درکار ہیں۔ اور اس کے بعد بھی یہ عنوان نشہ تکمیل ہی تصور کیا جائے گا۔

حضرات! آج کا دور ترقی یافتہ دور کہا جاتا ہے۔ دنیا کے سائنسی مالک جنہوں نے نئی ایجادات اور قوتِ عمل کی نوعِ بنوع شاہکاروں سے اپنے کو حیرت کدہ عالم بنا رکھا ہے۔ یقیناً اس سائنس دان دور میں انہیں حق ہے کہ وہ اپنے بلند بنگ نعروں سے دنیا کو مخاطب کر کے اپنی فکری برتری کا اعلان کریں۔ اور یہیں بھی کسی حد تک اس کے اعتراضات میں کوئی تامل و تکلف نہیں۔

واضح رہے کہ اس اعتراف کے باوجود ہم کسی احساسِ کمتری میں بھی مبتلا نہیں ہیں۔ چونکہ ہم ایک ایسے مذہب کے پیروکار اور ایسے ہادی و ریفارمر کے منقاد و مطیع اور اطاعتِ شعارامی اور غلام ہیں جو مادیات سے زیادہ روحانیت کے عرف و ارتقا پر زور دیتا ہے۔ اور اسی قانون کے زیرِ فرمان لے اور اس کے ذیلی دفعات نہ تو کاغذی صفحات تک محدود رہے اور نہ ہی طاقِ نسیاں کی نذر ہو کر رہ گئے۔ بلکہ اس پر عمل پیرا ہونے والے ہر ہدی اور ہر دور میں آفتابِ مہتاب کی طرح صدرِ مجلس بن کر رہے۔ اور ان کے روشن و تابناک نقوشِ قدم کو ہر دور میں مشعلِ راہ تصور کیا گیا۔

حضرات! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ آج کا دور ترقی یافتہ دور کہا جاتا ہے، لیکن اس ترقی یافتہ دور میں کسی ملک اور صوبہ سے نہیں بلکہ

پوری دنیا سے بس صرف ایک سوال کیجئے کہ اسے آسمان پر محل اٹھانے کا خواب دیکھنے والو! ہم تم سے دس پانچ نہیں بلکہ دنیا کی پوری آبادی سے صرف ایک ایسا انسان چاہتے ہیں، جو بیک وقت دنیا کو یہ کہہ کر بلارہا ہو کہ اے لوگو! تم مفکر بننا چاہتے ہو تو میرے قریب آؤ، مفکر و محدث بننا چاہتے ہو تو میرے قریب آؤ، منطقی و فلسفی بننا چاہتے ہو تو میرے قریب آؤ، بلند پایہ خطیب اور ادیب شہیر بننا چاہتے ہو تو میرے قریب آؤ۔ قاضی و مفتی اور سپہ سالار بننا چاہتے ہو تو میرے پاس آؤ۔ کمانڈر بننا چاہتے ہو تو میرے پاس آؤ۔ کامیاب تاجر و سوداگر بننا چاہتے ہو تو میرے پاس آؤ۔ عابد شب زندہ دار بننا چاہتے ہو تو میرے پاس آؤ تو آج اس سوال کے سامنے ساری دنیا گھٹنے ٹیک دے گی اور نیک بنتی اور عاجزی سے اپنی تہی داسی کا اعتراف کرنے ہوئے اسے کہنا پڑے گا کہ آج ہم میں کوئی انسان ایسا نہیں جو دنیا کے ہر انسان کا دامن مراد و طلب کے مطابق گوہر مقصود سے بھر سکے لیکن دنیا کی بھری آبادی میں اگر کوئی قوم اپنی پیشانی بلند کر کے چل سکتی ہے تو وہ قوم مسلم ہے۔

آج ہم دنیا سے کہہ سکتے ہیں کہ اے لوگو! تم میں کوئی انسان کامل نہیں لیکن اگر سچے دل کی تڑپ اور قلب کی گہرائیوں سے تمہیں کسی ایسے رہبر کامل کی تلاش ہے تو کہیں اور نہ جاؤ مصطفیٰ کی بارگاہ کرم میں آجاؤ۔ یہ صدیق اکبر، فاروق اعظم، ذوالنورین، حیدر کرار، ابو ہریرہ، ابو عبیدہ بن الجراح، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن زبیر، یہ سب کے سب اسی درسگاہ علم و حکمت کے خوشہ چین ہیں۔ تاریخ عالم کی پیشانی پر جن کا نام آج بھی سنہرے حروف سے لکھا ہوا ہے۔ حوادث روزگار اور گردش لیل و نہار نے کتنی تاریخ ساز شخصیتوں کے کارناموں پر سیاہ

پردے ڈال دیے ہیں مگر دریں گاہِ نبوت سے یہ وہ فیض یافتہ جماعت ہے جن کی زندگی کے نفوس کو تاریخ نے ہمیشہ کے لئے اپنے کلبے سے لگا رکھا ہے۔ یہ تاریخ نہ تو خانہ ساز مٹی اور نہ ہی یہ جواہرات ابی نیشن تھے کہ تدریجاً ان کی روشنی مدہم پڑ جاتی بلکہ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے اس کا اجالا اور بڑھتا جا رہا ہے۔ اور آج کا انسان کلمہ نہ پڑھنے کے باوجود ہادی عالم صلی اللہ علیہ وسلم نیز ان کی زندگی سے قریب تر آتا جا رہا ہے۔ یہ تو ہماری کم نصیبی ہے کہ کلمہ گو ہو کر ہم ان کی زندگی سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ آج یورپ کی نقالی میں ہیں منزہ آتا ہے، ہم پیچھے رہ کر کبھی اپنے تائبناک ماضی کا سویرا اور اجالا دیکھنا نہیں چاہتے اسے لوگو! یہ تباہی و بربادی خود نہیں آئی ہماری لائی ہوئی ہے۔ خود اسے ہم نے اپنا گھر اور دروازہ دکھلایا ہے۔ کچھ تو شب ہے جہاں پانی مر رہا ہے۔

بہر حال! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ آج کی تمام قوموں میں اگر کوئی اپنا سرا دہنچا کر سکتی ہے تو وہ قوم مسلم ہے۔ اسی کی تجوری میں زندگی کا ایسا گراں مایہ سرمایہ ہے جس سے دنیا کی تمام تجوریاں خالی ہیں۔ آج کی مضطرب و بے چین آبادی کو امن و شانتی کا بھرپور اور باور پیغام اگر کہیں مل سکتا ہے تو اسلام ہی کے دامن میں مل سکتا ہے اسلام جو ہادی عالم اور محسن انسانیت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ۲۳ سالہ مکی و مدنی زندگی کا خلاصہ و بخور ہے۔ جس پیغمبر اسلام کے پاکیزہ اخلاق اور زندگی کی نسبت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کہا کہ خُلعتُ اَلْیَہُ اَنْ اَنْزِلَ عَلَیَّ فَرَمَا۔ گو یا قرآن پیغمبر نے پڑھ کر سنایا اور قرآن بن کر دکھایا۔

حضرات! ایسے ہادی کے لئے خدا فرماتا ہے۔ اے مصطفیٰ! تم

حضرات! نہ جانے میں کن کن کاٹوں میں الجھ گیا۔ میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ سرکارِ معلم ہیں آج تھوڑے سے وقت میں ان کی معلانہ زندگی کا ایک سرسری جائزہ پیش کر رہا ہوں۔

حضرات! میرے سرکار ایسے معلم ہیں کہ جہاں دیکھو وہیں معلم ایک چوتھرے پر دیکھو وہاں معلم۔ یہ وہ درس گاہ ہے کہ جن کے طلبہ کو اصحابِ صفہ کہا جاتا ہے: ابو بکر، سیدنا فاروق اعظم، سیدنا عمار، سیدنا علی رضی اللہ عنہم، سیدنا زید بن ثابت، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم یہ سب اسی درس گاہ کے تربیت یافتہ ہیں۔ ان کا نصاب سو پچاس کتابوں پر مشتمل نہیں تھا بس ایک معلم اور ایک کتاب۔ معلم سرکار ہیں اور کتاب قرآن۔ جو بھی جو ان اس درس گاہ میں داخلہ لیتا وہ پوچھتا کیا پڑھنا ہو گا۔ قرآن جس کا کوئی سہ ماہی و شش ماہی امتحان متعین نہیں تھا۔ معلم پڑھاتا اور پلاتا جا رہا ہے تہنیکانِ علوم سیراب ہوتے جا رہے ہیں۔

ان کا کوئی سالانہ امتحان بھی متعین نہیں تھا۔ ان کی امتحان گاہ اللہ کا گھر ہے۔ امتحان معاشرے میں معاملات کا رکھ رکھاؤ یا ان کی عیالی زندگی بھی کانٹے تھے جس پر ان کی زندگی تولی جاتی تھی، یہی وہ کسوٹی تھی جس پر کھرے کھوٹے کو جانچا پرکھا جاتا تھا۔

حضرات! ہم نے سرکار کو ایک چوتھرے پر دیکھا تو معلم بابا اب اور آگے بڑھے۔

ایک بار آقائے کائنات نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہمراہ ایک سو کھے درخت کی ٹہنی کو جنبش دیا۔ سرکار کے جنبش دینے سے درخت کی پتیاں جھڑنے لگیں۔ آقائے کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے فرمایا "دیکھ رہے ہو کیا ہو رہا ہے۔ صی بہ نے

عرض کیا، یا رسول اللہ! آپ کے جنبش دینے سے درخت کی پتیاں جھڑ رہی ہیں تو اس جواب کے بعد سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جس طرح میرے جنبش دینے سے درخت کی پتیاں جھڑ رہی ہیں، ایسے ہی جب مسلمان وضو کرتا ہے تو اس کے پانی سے اس کے گناہ جھڑ جاتے ہیں ہم نے آبادی سے باہر دیکھا تو معلوم پایا۔"

نکتہ :- ایک بار سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ کے زمانے میں کسی نے اس حدیث سے متعلق یہ سوال کیا، یہ سلیمہ میں نہیں آتا کہ وضو کے پانی سے گناہ کس طرح جھڑ جاتے ہیں تو آپ اسے اپنے ہمراہ مسجد لے گئے اور اس پر ایک توجہ خصوصی فرمائی جس سے آنکھوں کے کچھ حجابات ہٹ گئے۔ اسی اشار میں ایک شخص آیا اس نے وضو کرنا شروع کیا امام محترم نے فرمایا، یہ دیکھو کہ اس کے اعضائے وضو سے جو پانی گر رہا ہے وہ کیسا لگتا ہے۔

چنانچہ اس نے غور سے دیکھا، اور یہ کہا کہ اس کا پانی کچھڑ کے مانند معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایک دوسرے کے بارے میں فرمایا اب اسے دیکھو، اس کا پانی کیسا لگتا ہے اسے دیکھ کر اس نے کہا اس کا پانی مٹیالے رنگ کا ہے جیسے پانی میں مٹی ملا دی گئی ہو۔ اب تیسرے نے وضو کرنا شروع کیا آپ نے فرمایا اسے دیکھو! اسے دیکھ کر اس نے کہا اس کا پانی بالکل صاف و شفاف معلوم ہوتا ہے۔

اس کے بعد آپ نے ان تینوں کو اپنے پاس بلایا جس نے پہلے وضو کیا تھا اس سے دریافت فرمایا تم نے کون سا گناہ کیا ہے؟ یہ سننے ہی بدن پر رخشہ طاری ہوا اور ہونٹوں پر کچکی۔ سوچا یہ کوئی اور نہیں پوچھ رہا ہے اس دور کا امام، اور اس کا ولی پوچھ رہا ہے۔ میں اس سے

اپنے جرم پر پردہ نہیں ڈال سکتا۔ یہی آواز میں بولا حضور مجھ سے زنا کا گناہ صادر ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا چونکہ یہ گناہ کبیرہ تھا اس لئے اس کا گناہ کبیرہ کی شکل میں ٹپک رہا تھا۔ پھر دوسرے کو بلا کر پوچھا اب تم بتاؤ کہ کون سا گناہ کیا ہے۔ وہ بھی امام کے علی رعب و جلال سے واقف تھا اس نے عرض کیا کہ مجھ سے جھوٹ کا گناہ، صادر ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جھوٹ زلمے سے کم درجہ کا گناہ ہے، لہذا یہ میٹلے رنگ میں بہ رہا تھا۔

پھر آپ نے تیسرے کو بلا کر دریافت فرمایا کہ اب تم بتاؤ، کہ کون سا نیک کام کرتے ہو؟

خود فرمائیے، یہاں انداز سوال بدل گیا۔ اب یہ سوال نہیں ہے کہ کون سا گناہ کرتے ہو بلکہ یہ سوال ہے کہ کون سا نیک کام کرتے ہو؟ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گیا، سوچا کہ آج راز کھل گیا۔ جواب دیا حضور میرے پاس اس کے سوا اور کوئی نیکی نہیں کہ ایک نماز ادا کر کے دوسری نماز کا انتظار کرتا ہوں۔ فرمایا چونکہ گناہ ہی نہیں تھا اس لئے اس کے بچنے اور بچنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

حضرات! یہاں پہنچ کر یہ بات خود روشن ہو گئی کہ تمام لگا ہی سے نہیں دیکھ پائیں جسے نگاہ نبوت دیکھا کرتی ہے۔

یہاں پہنچ کر ایک اور بات یاد آگئی، ایک بار ایک اعرابی بدو صحرائیں ایک ریگستان سے گزر رہا تھا، پیاس کی شدت سے بے چین و بے قرار تھا۔ کوسوں دور کہیں باقی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اسی حال میں ایک انگریز کا گزر ہوا۔ اسے ترس آیا۔ اس نے پوچھا اے بدو! کیا تجھے باقی چاہئے۔ اس نے کہا کہ ہاں۔ اس نے مشکیزے سے ایک برتن میں باقی نکال کر بدو کی طرف بڑھایا۔ اور ایک دو برتن اسے

دی اور کہا کہ پینے سے پہلے دور بین سے پانی کو دیکھ لو جب اس نے اس پانی کو دیکھا تو بہت ہی چھوٹے چھوٹے کپڑے نظر آئے۔ جو بغیر دور بین کے نظر نہیں آ سکتے تھے۔ یہ دیکھتے ہی وہ برجستہ کہنے لگا اَلصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا سَیِّدِ الْمَرْسَلِینَ، یا حَبِیْبِ اللّٰہِ، یا مَبِی اللّٰہِ۔
انگریز نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا کہ بہت تعجب کی بات ہے۔ پانی میں نے دیا، دور بین میں نے دی، میرے احسانات کا شکریہ تو تم نے چھوٹے منہ بھی ادا نہ کیا۔ اور اپنے ہی پروردگار کو سلام بھیج رہے ہو۔

اعرابی نے جواب دیا: جب تم نے پانی دیا تو مجھے اب سرکار کی ایک بات یاد آ گئی۔ میرے غیب داں نبی نے بہت پہلے فرمایا تھا کہ سلمان ہر پانی پر بھروسہ نہ کرے۔ بعض پانی ایسے بھی ہوتے ہیں اس میں اتنے ہی باریک اور چھوٹے کپڑے ہوتے ہیں جو آنکھوں سے نظر نہیں آتے۔ تو آج دور بین نے اس کی تصدیق کر دی میں نے محسوس کیا کہ جسے عام نگاہ نہیں دیکھ پاتی۔ اسے نگاہ نبوت دیکھا کرتی ہے۔ اب تم خود بتاؤ اس دور بین کا احسان مانا جائے یا غیب داں نبی کا شکریہ ادا کیا جائے۔ بے شمار درود و سلام میرے نبی پر۔

گفتگو یہ چل رہی ہے کہ جہاں دیکھو میرے سرکار معلم ہیں۔

حضرات! ایک بار آقاؐ سے دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ایک صحابی کے گھر تشریف لائے یہ ان کا کرم تھا کہ اپنے غلاموں کو اس طرح نوازتے دل جیتنے کی بھی وہ ادھتی کہ کائنات ان کی سمٹی میں سمٹی چلی آرہی تھی۔ صحابیہ نے چھٹے پر ہانڈی چڑھا رکھی تھی۔ مالک کو نین لے رہا تھا دریافت فرمایا ہانڈی میں کیا پکا رہی ہو۔ کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں گوشت ابل رہا ہے حمید الکونین نے فرمایا کیا اس میں میرا بھی حصہ ہے

صحابیہ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! یہ تو صدقے کا گوشت ہے اسے اپنے اپنے اوپر حرام فرمایا ہے اسے میں کس طرح آپ کو کھلا سکتی ہوں؟ سرکار نے فرمایا اَللّٰہُ صَدَقَہُ وَکُنَّا هَذِیۡتَہُ بِہِ تَمَّہَا رَہُ لَہُ صَدَقَہُ تَبَہُ مَکْرَمَہُ لَہُ بِہِ ہُوگا۔ جب تم نے لیا تھا تو صدقہ تھا مگر اب مالک ہونے کے بعد تم مجھے دو گئی تو یہ صدقہ نہیں بلکہ ہدیہ ہے۔ ہم نے ایک صحابیہ کے گھر سرکار کو دیکھا تو معلوم پایا۔

نکتہ :- حضرات! ایک بہت ہی لطیف بات سماعت فرمائیں۔ سرکار نے اپنے اور آل رسول پر صدقہ حرام فرمایا۔ اس کا ایک فلسفہ یہ بھی ہے جسے میں اکثر بیان کرتا رہتا ہوں کہ اس طرح کی رقم کا انکالنا دنیا کے دوسرے مذاہب میں بھی ہے، جسے وہ ”دچھنا“ کہتے ہیں۔ مگر ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

دیکھئے عذر فرمائیے، ایک برہمن بھی مندر کے پجاری سے کہتا ہے کہ ”دچھنا دو“ پڑ کر و۔ لیکن وہ اس رقم کو لینے کے لئے خود اپنے دامن کو پھیلا دیتا ہے۔ مگر قربان جائیے، میرے سرکار پر دنیائے اسلام کو خیرات، زکوٰۃ، صدقات کی تعلیم فرمائی۔ لیکن یہ حکم دے کر ہمیشہ کے لئے اپنا دامن سمیٹ لیا۔ اور اپنا ہی نہیں، آل محمد کا دروازہ بھی بند کر دیا کہ یہ کھوٹا مال اس دروازے تک نہ پہنچے۔ تاکہ کل دنیا یہ نہ کہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ و صدقات کا مسئلہ اس لئے اپنی قوم کو بتایا کہ اسی بہانے سے ان کی اور ان کے گھرانے کی پرورش ہو سکے درود و سلام اس نبی پر جس نے قانون دے کر قانون کا پھرم رکھ لیا۔

حضرات! گفتگو ابھی یہی چل رہی تھی کہ جہاں دیکھو سرکار معلوم ہیں ایک بار آقائے کائنات تشریف فرما ہیں اور ادب آشنا

صحابہ کرام ارد گرد بیٹھے ہوئے جمال نبوت کا نظارہ کر رہے ہیں اسی
اشار میں صحابہ پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ اپنے حال سے بے خبر
ہو گئے۔ اور اتفاقاً سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نشست
چھوڑ دی۔ سب سے پہلے جو خبردار ہوئے وہ سیدنا ابو ہریرہ
ہیں۔ دیکھا ساتھی موجود مگر آقا نہیں۔ یکایک اٹھ کھڑے ہوئے
خیال آیا کوئی شریک نہیں کوئی گزند نہ پہنچا ہے۔ سرکار کی تلاش میں
نکل پڑے۔ اور تلاش کرتے کرتے ایک باغ تک پہنچ گئے۔
اور وہیں رک گئے۔

واقعہ کی تفصیل جاننے سے پہلے یہاں پر ایک نکتہ سماعت
فرمایں :-

نکتہ :- یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ سرکار کی تلاش میں
حضرت ابو ہریرہ باغ تک کیوں نکل گئے، جہاں
مل سکتے تھے وہاں جانا چاہئے تھا۔ حضرت عائشہ سے دریافت
کرتے، کاشانہ فاطمہ پر جاتے وہاں پتہ لگانے۔ یہ باغ تک جانے
کے کیا معنی؟

حضرات! راز یہ ہے کہ دریافت اسے کیا جانتا ہے جو اپنی رہ گئی
پر اپنے گزرنے کی کوئی نشانی نہیں چھوڑتا۔ ہم کو اور آپ کو پوچھا
جائے گا۔ زید و بکر کو دریافت کیا جائے گا۔ لیکن اس عالم آب
و گل میں ایک ایسا بشر بھی ہے جو کسی راہ سے گزرتا ہے، اپنی علامت
و نشانی چھوڑتا جاتا ہے۔

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے

کچھ دیتی ہے شرمی نقش پا کی !

گلی پسینے کی خوشبو سے ہکتی جا رہی ہے۔ جب وہ خوشبو

ہی غمازی کر رہی ہے اور پتہ بتا رہی ہے تو ابو ہریرہ کے ڈھونڈنے اور پوچھنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

چنانچہ جہاں تک خوشبو ملی بڑھتے گئے اور جب خوشبو نہ ملی قدم رک گئے۔ حدیث مبارک کا مفہوم یہ ہے کہ باغ میں جب اندر جانے کا کوئی دروازہ نہ مل سکا تو وہ پرنالہ جس سے باغ کے اندر پانی جاتا تھا اسی راہ سے اپنے کو سکوڑ کر ابو ہریرہ باغ میں داخل ہو گئے جیسے ہی داخل ہوئے جیسے ہی باغ میں پہنچے عین اعظم، معلم انسانیت رومی قداہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت سے شرف ہوئے دیکھا کہ آقائے کائنات جلوہ افروز ہیں۔ سلام عرض کیا، آنکھیں قدم بوس ہوئیں۔

اب جب کہ محبوب کا پتہ لگ گیا تو ساتھیوں کا خیال آیا۔ عرض کیا، یا رسول اللہ جیسے میں بے چین ہو کر آپ کی تلاش میں لگ گیا ویسے ہی دوسرے صحابہ بھی پریشان ہوں گے۔ اجازت مرحمت فرما میں تاکہ میں انھیں مطلع کر دوں۔

ایک لطیف اشارہ :- یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ابو ہریرہ جب چلتے تھے تو اسی وقت ان میں سے کسی کو لے لیتے۔ اب وہ کیوں یاد آئے۔

حضرات! اس نیکے کو اہل محبت ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اللہ جسے توفیق دے۔ انسان کے بس کا کام نہیں ہے۔

اللہ جسے توفیق دے انسان کے بس کا کام نہیں
فیضانِ محبت عام تو ہے، عرفانِ محبت عام نہیں
محترم حضرات! یہ بات غیرتِ عشق کے خلاف ہے کہ محبوب کی

تلاش میں ساتھی کو ڈھونڈا جائے اسے غرت محبت نے گوارہ نہیں کیا
جو ابو ہریرہ کا قدم اٹھو رہا تھا وہ محبت کا قدم تھا۔ اب جب منزل
مل گئی تب ساتھی یاد آئے۔

بہر حال ابو ہریرہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! اگر حکم ہو تو میں
ساتھیوں کو باخبر کر دوں؟ سرکار نے فرمایا، میرے پاس اگر کچھ لئے
بغیر جانا چاہتے ہو؟

ابو ہریرہ سمجھ گئے یا تو وہی اتری ہے، قرآن طے کیا یا حدیث
مبارک، سرکار نے فرمایا یا اباہریرۃ من قال لا الہ الا اللہ
عند دخل الجنة اسے ابو ہریرہ جس نے لا الہ الا اللہ کہا وہ جنت میں
داخل ہوا۔

اب حدیث کو گرہ بنا کر جب ابو ہریرہ چلنے لگے تو سرکار نے
فرمایا ایسے نہ جاؤ میری نعلین (جوتا مبارک) اپنے ساتھ لیتے جاؤ۔ چنانچہ
نعلین مبارک کو سرکا تاج بنا ڈالو چلے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

جو سر پہ رکھنے کو مل جائے نعل پاک حضور

تو پھر کہیں گے کہاں تاجدار ہم بھی ہیں

جیسے ہی کھڑا اور آگے بڑھے سب سے پہلے فاروق اعظم سے
ملاقات ہوئی سلام کے بعد حضرت فاروق اعظم نے آگے بڑھنا
جاا۔ حضرت ابو ہریرہ نے عرض کیا پریشان نہ ہوں، میں نے پتہ
لگا لیا ہے خوفلاں باغ میں تشریف فرما ہیں، مگر فاروق اعظم کو بند رکھا
چین کہاں؟ آگے بڑھنا چاہا۔ ابو ہریرہ نے عرض کیا میں سرکار کی
بارگاہ سے آ رہا ہوں، کیا کچھ لئے بغیر آپ جانا چاہتے ہیں؟ حضرت
فاروق اعظم کھڑے ہو گئے۔ ابو ہریرہ نے عرض کیا آؤ قلم و دھما
نے ارشاد فرمایا ہے کہ:-

اذهب بنعلیٰ ہاتین فمن لقیك من وراء هذا المحاطیٰ یشہد ان لا
 الہ الا اللہ مستیقنا بہا قلبہ نبشروک بالجنة۔ (مشکوٰۃ شریف کتاب ایمان باب اول مسلم بن
 نبیہ۔ میری دونوں نعلین کو لیجاؤ اس دیوار کے پیچھے جو تم سے اس حال میں ملے کر یقین
 قلب کے ساتھ لا الہ الا اللہ پر گواہی گواہی دیتا ہو تو اسکو جنت کی بشارت دیدو۔

یہ سنتے ہی غصہ میں فاروق اعظم کا چہرہ تھما اٹھا حتیٰ کہ زور سے
 دھکا دیا جس سے ابو ہریرہ زمین پر گر پڑے۔ ابو ہریرہ نے کہا
 اے عمر میں آپ کو اللہ کے رسول کی حدیث سنارہا ہوں اور آپ میرے
 ساتھ اس طرح پیش آتے ہیں؟
 فاروق اعظم نے فرمایا

چلو ہم دونوں ساتھ ساتھ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوں۔ اور
 خود حضور ہی سے استفسار کیا جائے۔ چنانچہ یہ دونوں حضرات باغ
 میں پہنچے۔ آقائے کائنات سے سلام عرض کرنے کے بعد فاروق
 اعظم نے عرض کیا یا رسول اللہ! ابو ہریرہ ایسا کہہ رہے ہیں، کیا
 سرکار نے ارشاد فرمایا ہے؟

یہ سن کر سرکارِ دو عالم نے ارشاد فرمایا کہ ہاں اے عمر میں
 یہ کہا ہے۔ اب فاروق اعظم کے سامنے ابو ہریرہ نہیں ہیں بلکہ پیغمبر
 خدا ہیں۔ آنکھیں جھک گئیں۔ بس دبی زبان سے اتنا عرض کیا یا رسول
 اللہ! کہیں لوگوں میں عمل کی طرف سے تساہلی نہ پیدا ہو جائے۔

سوال: لیکن اب کلمہ پڑھاؤ یم بعلیں بجاتی ہوگی کہ مشاق نظامی
 سے اچھا میٹرل گیا۔ اب کلمہ میں محمد رسول اللہ کہنے کی ضرورت
 نہیں بس لا الہ الا اللہ پڑھا دینا کافی ہے۔

جواب: حضرات! محدثین کرام اس کا بہت ہی معقول اور سنجیدہ جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جناب! اس سوال کا جواب خود اس حدیث میں موجود ہے۔ یعنی جب سرکار نے حدیث عطا فرمائی۔ اور ابو ہریرہ حدیث لے کر چلنے لگے تو سرکار نے یہ بھی فرمایا تھا کہ صرف حدیث لے کر نہ جاؤ، میری نعلین مبارک بھی ساتھ لے جاؤ۔ یہی اس سوال کا جواب ہے۔

اس میں اشارہ کرنا تھا کہ لا الہ الا اللہ اس وقت کہنا کافی ہو گا۔ ابو ہریرہ کی طرح میری جوتیاں اس کے سر کا تاج ہوں۔ سر پر نعلین مبارک کا رکھنا خود اس بات کی دلیل ہے، اگر نبی و رسول کو نہ مانتا تو ان کی جوتیاں اپنے سر پر کیوں رکھتا؟ علاوہ ازیں بہت ہی لطیف اور پتے کی بات یہ بھی ہے کہ اگر کوئی یہ کہتا ہو کہ کلہ میں صرف لا الہ الا اللہ پڑھنا کافی ہے تو اس سے دریافت کیجئے کہ یہ بات تم کو کہاں ملی؟ تو یقیناً وہ یہی جواب دے گا کہ حدیث سے۔ لہذا اب آپ دوسرا سوال کیجئے کہ حدیث کہتے کسے ہیں تو یقیناً وہ یہی کہے گا "قول رسول" کو یعنی جو رسول اللہ نے فرمایا وہ حدیث ہے۔

بس معلوم ہوا کہ کسی بات کو حدیث کہنے سے پہلے اس کے قائل کو نبی و رسول ماننا ضروری ہے۔ اگر ان کو نبی و رسول نہ مانو گے تو اسے حدیث کہہ ہی نہیں سکتے۔

لہذا معلوم ہوا کہ اس کو حدیث کہنے سے پہلے سرکار کو نبی و رسول مان لے۔ ورنہ اسے حدیث کہا نہیں جاسکتا۔

والحمد للہ علیٰ ذالک۔
ہاں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جز بول کر کل مراد لیتے ہیں

مثلاً ایک پیر نے اپنے مرید سے کہا، سونے سے قبل "قل ہوا شربٹھ" پڑھ لیا کرو، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ بس قل ہوا شربٹھ پڑھے، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ پوری سورۃ اخلاص پڑھے۔ قل ہوا شربٹھ سے لے کر کفواً احد تک۔

ایسے ہی کسی نے کسی سے یہ کہا ارے بھی بسم اللہ پڑھ لو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ بس خالی بسم اللہ پڑھے بلکہ رحیم تک پڑھو آپ نے کہا میں نے احمد شریف پڑھ لی اس کے معنی یہ نہیں، کہ خالی احمد پڑھ لیا۔ بلکہ احمد سے لے کر ولا الضالین تک پڑھ لیا۔ ایسے ہی جس نے لا الہ الا اللہ پڑھا اس سے مراد پورا کلمہ پڑھ لیا۔

ابھی میں نے کہا تھا کہ حدیث "قل رسول" کو کہتے ہیں اس سلسلہ میں آپ کو یہ بتادینا ضروری ہے کہ حدیث کی تین قسمیں ہیں: ۱۱ حدیث قوی۔ (۲) حدیث فعلی حدیث تقریری۔ اب ان سبھوں کی تعریف ذہن نشین فرمالیں۔ حدیث قوی وہ ہے جسے رسول نے زبان مبارک سے ارشاد فرمایا ہو۔

حدیث فعلی:- وہ ہے جسے رسول اللہ نے کر کے امت کو سکھایا اور بتایا ہو۔

حدیث تقریری:- وہ ہے کہ کسی صحابی نے سرکار کے پاس کوئی بات کہی یا کوئی کام کیا ہو۔ اس پر سرکار نے ان کو منع نہ فرمایا ہو تو وہ حدیث ہی ہے۔

مگر حدیث تقریری یعنی پیغمبر خدا کے سامنے کسی صحابی کا کچھ کہنا یا کچھ کرنا، اس پر سرکار کا نہ رد کتنا اس کی صحت کی دلیل ہے۔ لہذا

اس کی بھی نسبت بالواسطہ نبی ہی کی طرف کی جائے گی۔
حضرات! ابھی تک تو سرکار کی معلانہ زندگی ہی برگشتہ ہو رہی
تھی۔ غرض کہ ہم نے صبراً دیکھا تو معلم دیکھا، ایک صحابیہ کے کاشانہ پر دیکھا
تو معلم پایا۔ بلغ و باغیچے میں دیکھا تو معلم دیکھا، صحن کعبہ اور مسجد نبوی میں
دیکھا تو معلم دیکھا۔ قربان جائے ان کی اس عظمت و برتری پر۔

وقت ابھر ہوئے سوال کا جواب۔ بہت سے حقیقت نا آشنا، متعصب

اور نادان سوال کرتے ہیں کہ مسلمان جنگجو ہے اور اسلام تلوار کے زور سے
پھیلا۔ اور ہمارا کہنا یہ ہے کہ تلوار سے نہیں بلکہ اخلاق محمدی سے پھیلا ہے۔
حضرات! آہی تلوار سے سر قلم کیا جاتا ہے لیکن اخلاق کی تلوار سے
دلوں کی دنیا فتح کی جاتی ہے۔ مصطفیٰ کے ہاتھوں میں تو ہے کی تلوار نہیں، بلکہ
دلوں کی دنیا مسخر کرنے والی اخلاق کی تلوار تھی جس کے سامنے آہی تلوار کی
دھار گھٹل ہو جاتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سیدنا عمر قبول اسلام سے پہلے چراغ
نبوت کو گل کرنے ہی کے ارادے سے تو تلوار لے کر پہنچے تھے لیکن بھی سیدنا
عمر کی تلوار جنبش میں بھی نہ آئی تھی کہ اخلاق نبوت کی تلوار آگے بڑھ کر اپنا کام
کر گئی۔ اور وہ تلوار جو پیغمبر کا خون چوسنے اور پینے کی غرض سے نبی سے باہر
بھجکی تھی وہ شرمسار ہو کر نبی کے اندر چلی گئی۔

دوستو! میں یہ ایک ذیلی بات کہہ گیا۔ کہنا یہ ہے کہ اسلام تلوار سے
نہیں پھیلا۔ آپ اس سلسلے میں اسلام کا سب سے پہلا غزوہ ملاحظہ فرمائیں اور
وہ ہے غزوہ بدر۔ آپ تاریخ کا مطالعہ کر کے اس سے دریافت کیجئے کہ یہ
جنگ کہاں ہوئی تھی تب آپ کو معلوم ہو گا کہ مدینہ سے قریب۔

حضرات! اس جنگ کا مدینہ سے قریب ہونا خود اس کی دلیل ہے
کہ کفار مکہ مدینے پر چڑھائی کی غرض سے آئے تھے، خون قراہ، قتل و غارت

اور لوٹ مار کے ارادے سے نکلے تھے کسی کا سہاگ وٹنے اور کھوں کو
 یتیم بنانے کی نیت سے آئے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس جنگ کو مدینہ
 سے نہیں مکہ کے قریب ہونا چاہئے تھا۔ تب یہی الزام شکر اسلام پر آتا
 اور ایسا نہیں ہے۔

لہذا اب آپ کو تسلیم کرنا ہوگا کہ تلوار چلانا جرم ہے چلتی تلوار
 روکنا جرم نہیں ہے۔ کسی کے نشیمن میں آگ لگانا جرم ہے اس پر پانی کا
 چھڑکاؤ جرم نہیں ہے۔ کسی ظالم و جابر کے مقابل اس کی مداخلت یہ تو ایک
 جمہوری و دستوری حق ہے جس پر نہ بھی بندش لگائی گئی اور نہ کبھی پرہیز
 جاسکتا ہے۔ اگر غزوہ بدر میں تلوار چلی تو یہ قصور ان کا ہے جو مکہ سے
 سینکڑوں میل چل کر مدینہ پہنچے تھے۔

حیرت ہے! خطا کس کی اور الزام کس کے سر؟
 لہذا! معلوم ہوا کہ سلمان جنگ جو اور لڑا کا نہیں بلکہ وہ ایک
 جارج کے مقابل صرف اپنی مداخلت کرتا ہے۔ لہذا پہل ان کی ہے ہماری
 نہیں کسی کی پہل کے بعد اپنا دفاع کرنے والے کو جارج نہیں کہتے۔
 اور یہ کہنا کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے، یہ بھی سراسر غلط اور بے
 بن ہے۔ اس سلسلہ میں سرکار کا پیغمبرانہ مزاج ملاحظہ فرمایا:

سرکار صحابہ کو ہدایت فرماتے ہیں کہ وضو میں اتنا ہی پانی خرچ کیا
 جائے، جس قدر پانی کی ضرورت ہو۔ ورنہ خدا کے یہاں اس کی ایک
 ایک بوند کا محاسبہ ہوگا حتیٰ کہ الفاظ حدیث یہاں تک ہیں ولو کان
 علی شط نھر جاہی یعنی اگرچہ دریا اور پتی ندی کے کنارے ہی کیوں
 نہ وضو کرتے رہو۔

حضرات! یہاں پہنچ کر میں آپ کی توجہ کا طلب گار ہوں کہ شر
 کا ایک غلط و پرہیز گار بندہ، اشر کے حضور میں جانے کے لئے وضو

کر رہا ہے تو اتنے نیک کام اور نماز جیسی اہم عبادت کی ادائیگی میں اتنی سخت بندش لگا دی جا رہی ہے کہ آخرت میں قطرے قطرے کا حساب دینا ہو گا تو پھر مجھے کہہ لیئے دیجئے کہ جس پیغمبر کی نگاہ میں بہتے ہوئے دریائے پانی کے ایک ایک قطرے کی اتنی قیمت ہو تو آپ ہی بتائیں کہ پھر اس کی نظر میں انسانی خون کی کتنی قیمت ہوگی؟

بھلا وہ کب برداشت کر سکتا ہے کہ زمین پر خون ناحق گرایا جائے اسے اللہ کے بند و خدا کی دی ہوئی عقل سے کام لو۔

حضرات! اس فرمان نبوی سے اس بات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جس نبی کی نگاہ میں پانی اتنا قیمتی ہو، اس کی نظر میں انسانی خون کا احترام کتنا اور کس قدر ہو گا؟

یہیں پر میں اس نکتہ کا اظہار بھی مناسب سمجھتا ہوں کہ اسلام کی جنگ کافر سے نہیں کفر سے ہے۔ گویا ایک نظریہ کا ایک نظریہ سے، ایک فارمولے کا ایک فارمولے سے، ایک آئین و دستور کا دوسرے آئین و دستور سے جنگ ہے۔

گویا ظلمت نور سے متصادم ہے
جہل، علم کے مقابلے میں
صفت آری ہے اور باطل نے حق کو دعوتِ رزم دیا ہے
باطل دوئی پسند ہے حق لازوال ہے
شرکت مہکنا حق و باطل نہ کر قبول
(اقبال)

حسین اعظم

حضرات! میں ایک ایسی نادرد روزگار اور عظیم المرتبت
شخصیت کا نام لینے جا رہا ہوں جس کا نام سننے کے لئے بڑے
دل اور آشکبار آنکھوں کی ضرورت ہے۔ مجھے چہنچہن کہن
نے کبھی علی مرتضیٰ کے کاندھے پر دیکھا کبھی حضرت فاطمہ
زہرا کی گود میں۔ مجھے کائنات نے کبھی نانا کی لمبی میں دیکھا
کبھی یخ و تبر وستان، نیزوں اور اینوں کے درمیان۔
تلواروں کے سائے میں، برھیوں کی نوک پر جس نے
اپنا سب کچھ لٹا کر ناموس مصطفیٰ علیہ النجیۃ والثناء کو بچایا ہو
اور وقار اسلام کو عزت بخشی ہو جو فر کر امر ہو گیا، اور
جس کے خون کو کر بلا کی ریت نے جذب نہیں کر لیا۔ بلکہ
وہ آج بھی اسلام و مسلمان کے چہروں پر غانہ و سرخی کا کام
کر رہا ہے۔ وہ ہے میرا اور سب کا حسین اعظم
اب کلیجہ تھامئے اور ایک ایسا مسافر جو امیر کارواں تھا اس
کی داستان غم سنئے،

بھد کو سنو جو گوشت حقیقت نبوتش ہو
دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت ناک ہو

الحمد لله وكفى وسلاماً وعلى عباده الذي
اضطف

أعوذ بالله من الشيطان الرجيم
بسم الله الرحمن الرحيم

يا أيها الذين آمنوا استعينوا بالصبر والصلوة

إن الله مع الصابرين ولا تقولوا للمؤمنين

سبيل الله أموات بل خيلاء ولكن لا تعلمون

وقال رسول الله صلى الله تعالى عليه وآله وصحبه وسلم

أصحا كالنجوم بأيهم اقتديتم اهتديتم
(٢)

وقال رسول الله صلى الله تعالى عليه وآله وسلم

عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين
المهتدين -

رس
قال رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم

مثلا اهل بیت کسفینۃ لوح من رکبها
نجی ومن تخلف عنها عذرا ف

وقال رسول الله صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم:

اَنَا مَدِينَةُ الْعِلْمِ وَعَلَى بَابِهَا

حضرات! میری تقریر کا عنوان ہے حسین اعظم۔ اس عنوان سے متعلق میں نے حسب معمول قرآن مقدس کی ایک آیت مبارکہ کی تلاوت کی ہے۔ اور سید الکونین روحی فداء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی چار احادیث مبارکہ کو اسی عنوان سے منسلک کیا۔ میں سب سے پہلے تلاوت کی ہوئی آیت مبارکہ کا مفہوم عرض کروں گا پھر احادیث مبارکہ کی تشریح۔ اس کے بعد آیت کی تشریح اور توضیح۔

حضرات! جس آیت کی میں نے تلاوت کی ہے سب سے پہلے آپ اس کا مفہوم سماعت فرمائیں۔ خدا کا ارشاد ہے:

اے ایمان والو! تم لوگ مدد چاہو، مدد طلب کرو صبر اور نواز سے۔ بیشک اللہ صبر والوں کے ساتھ ہے! اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے گئے انہیں مردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہیں اور تمہیں شعور بھی نہیں۔

حضرات! یہ ہے اس آیت کا مفہوم جس کی میں نے تلاوت کی ہے۔ اس کی تشریح بعد میں کی جائے گی۔ اب ان احادیث مبارکہ کا مفہوم سماعت فرمائیں جسے میں نے اپنے موضوع کی مناسبت سے منتخب کیا ہے:-

۱۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: میرے

صحابہ کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ستارے۔ ان میں تم جن کی اقتدار و پیروی کرو گے ہدایت ہی ہدایت پاؤ گے۔

گویا صحابہ کرام آسمان کے ستاروں جیسے ہیں ان میں تم جس کے بھی دامن کرم سے وابستہ ہو جاؤ گے ہدایت رسیدہ اور نجات یافتہ ہو جاؤ گے۔
۲:- اور سرکار اہل بیت اطہار رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے بارے میں اللہ شاد فرماتے ہیں کہ "میرے اہل بیت کی مثال کشتی نوح جیسی ہے یعنی جس طرح جو لوگ کشتی نوح میں بیٹھے وہ سلامت رہے اور چھوٹ گئے۔ اور جو لوگ اس میں نہ بیٹھے وہ غرقاب ہوئے ڈوب گئے۔ اسی طرح میرے اہل بیت کی مثال ہے جو ان سے لگا ہوا رہے گا ان کے نقش قدم پر چلے گا وہ دین دنیا کے آلام و مصائب، عذاب و عتاب سے بچ جائے گا۔ اور جو ان سے کترا گیا اس کے لئے خسران اور گھاسٹے کے برابر ہیں۔"

گویا جو کلہ گویا ہدایت و نجات کا مستحق ہے وہ صحابہ کرام اور اہل بیت اطہار دونوں کی عقیدت و محبت سے اپنے دل کو معمور رکھے اور ان لوگوں کی رضا کو اپنی رضا سمجھے اور اس میں دین و دنیا کی صلاح و فلاح یقین کرے تاریخی واقعات کی روشنی میں اگر کہیں ذہنی خلجان پیدا ہوتا ہو تو اس کو دفع کرتا ہے۔

حضرات! ان کے نقش قدم کو نشان راہ بنائیے اس طرح کا اعتدال اگر کہیں مل سکتا ہے تو وہ صرف مذہبِ اہلسنت ہے جس میں صحابہ کرام اور اہل بیت اطہار دونوں کی عقیدت و محبت کو جزو ایمان سمجھا جاتا ہے،

دل کو تھا ما ان کا دامن تمام کے

ہاتھ اپنے دونوں نیکے کام کے

خدا کا شکر ہے کہ ہمارے ہاتھ میں دامن صحابہ بھی ہے، اور

دامن اہل بیت بھی۔ ہم صحابہ کرام اور اہل بیت اطہار کی عقیدت میں

ہوئے نفس یا تاریخی چکر کے قابل نہیں خواہ وہ جنگ جمل ہو یا جنگ صفین
حضرت علی مرتضیٰ اور حضرت عائشہ صدیقہ کی رائے کا اختلاف ہو یا حضرت
امام حسن یا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا اختلاف ہو اور ان کی
مصلحت بینی نہ تو ہم ان حضرات کے حکم ہیں اور نہ ثالث۔ اور سچے پوچھو تو
یہ ہمارا منصب بھی نہیں ہے۔ آخر یہ سر کا کیسا سودا ہے کہ سارے اختلاف
ہیں حل کر لئے جائیں۔ ایسے حوادث و معاملات جہاں عقیدت کی آہنی
دیوار میں شگاف آنے کا اندیشہ ہو، احادیث مبارکہ کو حکم و ثالث
ماننے کی بجائے ترازو لے کر ہم کیوں بیٹھ جائیں جب اللہ کے رسول کی
حدیث سے پتہ چل گیا کہ ہمارے لئے دونوں ہی واجب الاحترام اور
قابل تقلید و پیروی ہیں، تو تاریخی گوداب و بھنور میں پاؤں ڈالنے کے
بجائے خود سرکار کی حدیث اور فرمان نبوی کو کیوں نہ کسوٹی قرار دیا
جائے اس لئے ہم اہلسنت "اصحابی کا نجوم" اور "مثل اہل بنی کسفین" فتح
کے ہونے ہوئے اگر تاریخی روایات کو پس پشت نہ ڈالنے تو کم از کم
سکوت و خاموشی اختیار کیجئے۔

احادیث مبارکہ کے صراحت کے بالمقابل ایسی جرأت و جسارت
جس سے ان میں سے کسی کے بھی دامن کے چھوٹ جانے کا خطرہ ہو وہاں
ایک ایسی درمیانی راہ اختیار کرنی چاہئے جس سے نہ تو کسی جانب افراط کا
الزام آئے اور نہ ہی تفریط کا۔

ہی وہ طریقہ ہے جسے اہل سنت و جماعت نے محمود و پسندیدہ

قرار دیا ہے

حضرات! جب بات آئی گئی ہے تو مناسب ہے کہ اس کا آخری
فیصلہ کر ہی لیا جائے۔ دیکھئے جب کسی مقدمہ میں منصف باجج کے روبرو
مدعی اور مدعا علیہ کے وکیل بحث کرتے ہیں تو مدعی سے نیچا اس کا محرر اور

منشی ہے اور وکیل سے اونچا منصف اونچ ہے۔ دیانتداری سے بتلائے
دونوں وکلاء کی گفتگو سننے کے بعد فیصلے کا حق محرر کو ہے یا جج کو؟

یقیناً آپ ہی فرمائیں گے کہ یہ حق وکیل سے بڑے کو ملتا ہے چھوٹے
کو نہیں۔ بس ایسے ہی حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، اور
حضرت شیر خدا علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت سیدنا امام حسن مجتبیٰ
اور سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا وغیرہ کے جو اجتہاد و اختلافات
ہیں ان میں ان کے بعد والوں یا ان سے وہ جو درجات میں کمتر ہوں انہیں
کوئی حق نہیں کہ وہ فیصلے کی ترازو لے کر بیٹھ جائیں اور جسے چاہیں جیل کی
سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیں، یا پھانسی کے تختے پر لٹکا دیں۔

اولاً تو احادیث کے ہوتے ہوئے ہم کسی اور کے فیصلہ کے محتاج
ہی نہیں۔ ثانیاً اگر تاریخ حدیث کے مزاحم ہو جائے تو تاریخی روایات کی
ہم مناسب تاویل کریں گے جس سے مرتبہ حدیث کو آہٹ نہ پہنچے اور
اگر تاویل کی گنجائش نہ نیکل سکی تو ہم تاریخی روایات پر بہر حال احادیث کو
ترجیح دیں گے۔ اور فیصلہ اللہ اور اللہ کے رسول کے سپرد کر دیں گے
وہ احکم الحاکمین ہے اور اس کے نائب مطلق اور خلیفہ اعظم سید الکونین
سلطان دارین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں۔

حضرات! ایک ذیلی بحث میں ہم نے شاید کہ آپ کا کچھ زائد وقت
لے لیا مگر یہ گفتگو میرے موضوع کی اہم کڑی تھی۔ اس لئے اسے نظر انداز
کر دینا مناسب نہیں سمجھا۔ یہ ایک بہت ہی اہم اور تفصیلی بحث ہے لیکن
اختصار کے پیش نظر میں نے بہت ہی سمیٹ کر اسے پیش کیا ہے۔

نکتہ :- حضرات! ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ سرکار نے صحابہ کو ستارہ

فرمایا اور اہل بیت اطہار کو کشتی نوح۔ آخر اس کا فلسفہ کیا ہے؟ اب میں آپ کی توجہ چاہتا ہوں۔

دوستو! یہ اس نبی کا کلام ہے جس نے خود اپنے متعلق فرمایا "انا جامع الکلم" میں کلمات کا جامع ہوں۔ یہ تو نبی ہی کی شان ہے کہ اشارات و کنایات میں ایسا فرمادیں کہ ہزاروں صفحات رنگینے کے بعد بھی ایک قلم کار ادائیگی مفہوم میں اتنا کامیاب نہ ہو سکے جتنا کہ نبی صرف ایک حرف میں بے شمار معنی پیدا کر دے۔ یہ تو اپنے اپنے غور و فکر کا معیار اور فہم و رائے پر موقوف ہے کہ جس کی جیسی پرواز تھی وہ وہاں تک پہنچ گیا۔

واضح رہے کہ نبی کا ایک ایک حرف بہت ہی چھٹا تھتا ہوتا ہے کسی بھی ادائیگی مفہوم میں الفاظ بہت ہی محتاط ہوتے ہیں لہذا ایسے ہی ستارہ اور کشتی نوح میں ایک ایسی مناسبت ہے جو مشاہدے کی روشنی میں عقلا و راوردان شعور وں کے مسلمات میں ہے۔

حضرات! آج کا بھی یہ دستور و معمول ہے کہ رات کی تاریکی میں جہاز کا سمت سفر معلوم کرنے کے لئے جہاز کے کپتان کو آسمان کے ستاروں پر نظر رکھنی پڑتی ہے۔ ان میں سے بعض ستارے سمت سفر متعین کرنے میں معاون و مددگار ہیں۔ اگر ان سے آنکھیں پھری جائیں تو اندیشہ ہے کہ جہاز کا سمت سفر بدل جائے۔ نیز یہ بھی خطرہ ہے کہ راہ کے بدل جانے سے جہاز کسی ایسی پہاڑی سے ٹکرا جائے جو سطح سمندر پر ابھری نہ ہو۔ اگر ایسا ہوا تو جہاز پاش پاش اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔

لہذا یہ بات واضح ہو گئی کہ جہاز کے کپتان کے لئے ضروری ہے کہ وہ ستاروں کی طرف سے غافل نہ ہوں ورنہ اس کے خطرات و

برے نتائج ظاہر ہوں گے۔ بس اب مجھے کہہ لینے دیجئے کہ ایسے ہی سرکار نے صحابہ کو ستارہ اور اہل بیت کو کشتی فرما کر اشارہ کر دیا کہ کشتی کے سوار اور خد ملاح کے لئے ضروری ہے کہ وہ ستاروں سے غافل نہ ہوں۔ اگر کشتی سوار ستاروں سے غافل ہو گئے تو سمت سفر کے بدل جانے کا اندیشہ یقینی ہے۔ جانا کہیں ہو گا اور یہ سوچئے گا کہیں۔

اس لئے اگر اس ساحل سے اس ساحل تک جانا ہے تو کشتی کی بھی ضرورت ہے اور ستاروں کی بھی۔ ایک بحری جہاز کو منزل سے ہٹنا ہونے کے لئے ضروری ہے کہ کشتی سے بھی تعلق رکھے اور اس کی نگاہ ستاروں پر بھی ہو۔ غرض ان دو لفظوں میں سرکار نے ایک ایسی محتذ اور نادرل صورت پیدا کر دی ہے کہ اگر اسے منظور کر لیا جائے تو نہ جانے کتنے پیچیدہ مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔

نکتہ :- حضرات! اب یہیں پر ایک بات اور بھی ملاحظہ فرمائیں گے۔ مثلاً ستاروں جیسی ہے اور اہل بیت نبوت کی مثال کشتی جیسی۔ تو آپ مجھے ایک بات بتائیں کہ ایک شخص کسی کشتی سے اس ساحل سے اس ساحل تک جانا چاہتا ہے مگر وہ ایسا مسافر ہے کہ ساحل پر کھڑے ہو کر کشتی کی تعریف کرتا ہے اس کا بڑھی پیت عمدہ ہے، پلے اور تختے بھی بہت مضبوط ہیں، سائز بہت مناسب ہے، نشستگاہیں بہت اچھی بنی ہیں، اور رنگ و روغن بھی بہت دلکش ہے نقش و نگار بھی اچھے بنے ہیں۔ چو اور پتو اور بہت مضبوط ہیں، ملاح بھی چست و چالاک اور ہشیار ہے۔ دن بھر تعریف کرتا رہا، ہفتہ بھر تعریف کرتا رہا، مہینہ بھر تعریف کرتا رہا، برسوں تعریف کی۔ اب سچ مجھے بتائیے یہ ساحل پر کھڑے رہ کر کشتی کی تعریف کرنے والا زندگی بھر تعریف کرتا رہا لیکن

کشتی کے قریب نہ آیا، نہ اس پر بیٹھا تو کیا محض تعریف کرتے کرتے دوسرے ساحل تک پہنچ جائیگا۔ یقیناً آپ فرمائیں گے ہرگز نہیں۔

لہذا یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ اہل بیت اطہار کی مثال جب کشتی جیسی ہے تو اگر کوئی محض ان کی تعریف میں لگا رہے مگر ان کا احاطہ شعار نہ ہو مطیع و فرمانبردار نہ ہو ان کے حکم پر چلتا نہ ہو تو وہ ساحل مراد تک نہیں پہنچے گا۔ توجہ طرح ساحل پر کھڑے ہو کر محض کشتی کی تعریف کرنے والا دوسرے ساحل تک نہیں پہنچ سکتا بس ایسے ہی اہل بیت کی محض تعریف کرنے والا کبھی بھی ہدایت و نجات یافتہ نہ ہو سکے گا۔ تا وقتیکہ ان کا فرمانبردار اور اطاعت شعار نہ ہو۔

حضرات! اب ہمیں پر ایک نکتہ اور ملاحظہ فرمائیں: میں آپ کی توجہ چاہتا ہوں:-

آپ خیال فرمائیں کہ اگر کشتی پر بیٹھ گیا تو آپ کو معلوم ہے کہ کشتی پر بیٹھنے والے کی کیفیت کیا ہوتی ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اگر کشتی میں سکون ہو تو اس پر بھی سکون، اگر کشتی جنبش میں آجائے تو اس کا بدن بھی ہل جائے کشتی کا رخ بدل جائے تو اس کا بھی رخ بدل جائے کشتی اگر بغور میں گھوم جائے تو یہ بھی گھوم جائے۔

معلوم ہوا کشتی پر بیٹھنے والا اپنی حرکت و سکون میں کشتی ہی کے تابع ہوتا ہے اس میں حرکت تو اس میں حرکت۔ وہ گھومے تو یہ بھی گھومے وہ ساکن تو یہ بھی ساکن۔ وہ متحرک تو یہ بھی متحرک۔

معلوم ہوا کشتی سوار اپنی نقل و حرکت وغیرہ میں کشتی ہی کے تابع ہے۔ لہذا یہ حقیقت کھل کر بے نقاب ہو گئی کہ جدھر اہل بیت کا رخ ہو۔ ادھر ان کے ماننے والوں کا بھی۔ جس سے علی مرتضیٰ امام حسن و حسین دوستی کریں۔ اس سے ان کا ماننے والا بھی دوستی کرے۔ ایسا

ہرگز نہیں ہو سکتا کہ حضرت علی رضی کسی کو اپنا دوست سمجھیں اور ان کا ماننے والا ان کے دوست سے عدالت کرے یہ حیدر رکڑا رضی اللہ عنہ کے منشا اور رضا کے خلاف ہے۔ اس طریقہ کار میں سنہن کریمین کی خوشنودی کی بجائے دل آزاری کا پہلو غالب ہے۔ ان کے نرم و نازک دل کو تکلیف و صدمہ نہیں پہنچانا چاہئے۔

اس مختصری وضاحت میں ستارہ اور شبنم کی مناسبت کو بہت ہی واضح کر دیا۔ اور یقین ہو گیا کہ نبی کا ایک حرف اور ایک جملہ ہزار صنعت کا بحر بیکراں ہوتا ہے۔ اور ایک کلمہ گو کو صحابہ و اہل بیت دونوں سے ہی عقیدت و محبت کا رشتہ رکھنا چاہئے۔ یعنی

صلی تمہیں چاہوں تمہارے چلنے والوں کو بھی چاہوں

فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ

(۱۱)

حضرات! ایک حدیث میں لے اور پڑھی ہے،

اَنَا مَدِیْنَةُ الْعِلْمِ وَحَلٰی بِاَیْمِہَا

سرکار فرماتے ہیں میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کے دروازے ہیں۔ اس سے شیر خدا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فضل و کمالات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے لہذا جسے علم کے شہر سے کچھ لینا ہو وہ ادھر ادھر سے نہ آئے، کو نہ پھانڈ کر آنے کی کوشش نہ کرے، چور دروازے سے داخلہ نہ لے بلکہ صدر دروازے سے آئے۔ اور وہ ہیں حضرت سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

حضرات! اب سے پہلے رواج تھا کہ دارالسلطنت کی حفاظت

کے لئے اس دور کے راجہ ہمارا جہ نواب اور سلاطین اپنے شہر کو چار دیواری سے گیر دیتے، مختلف سمتوں میں آئے جانے کے لئے دو ایک دروازے ہوتے

تھے جسے شہر پناہ کہتے تھے۔ آج بھی یہ دیواریں کہیں کہیں محفوظ ہیں۔ مثلاً
برہان پور، اگرچہ دیواریں بہت ہی شکستہ ہوتی جا رہی ہیں مگر شہر کلرکٹر
حصہ اس سے گھرا ہوا ہے۔ اور دروازے محفوظ ہیں۔ احمد آباد کے کچھ
دروازے رہ گئے باقی دھیرے دھیرے منہدم کے جا رہے ہیں۔ بیجا پور
میں بھی اس کے کچھ آثار باقی ہیں۔ راجستھان کے اکثر شہروں میں اس کے کھنڈرات
اور نشانات ملتے ہیں۔

اب اسی کی روشنی میں اس حدیث کا مہم سماعت فرمائیں،
سرکار فرماتے ہیں میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کے دروازے
ہیں۔ اس دروازے سے کئی چیزوں کی نشاندہی کر دی۔

حضرات! اگر شہر کے چار جانب دیوار نہ کھڑی ہو تو شاہراہ سے
چل کر جہاں سے داخل ہونا ہواں اگر دروازہ بنادیا جائے تو آپ خود
نیصلہ فرمائیں کہ اس میں دروازے سے کیا فائدہ ہوگا، جب اس کے دائیں
بائیں کھلا ہوا ہے۔ آدمی جہرے چاہے جہاں سے چاہے چلا جائے۔
لہذا معلوم ہوا کہ ایک دروازہ اپنے ارد گرد دائیں بائیں دیوار چاہتا

(۲)
حضرات! اگر دیواریں تسلیم کر لی جائیں تو دیوار اپنی "نیو" اور
بنیاد چاہتی ہے۔ اگر دیوار بغیر بنیاد کے ہو تو سطح زمین سے یہ اٹھتی ہوئی
دیوار نہ تو آندھی کا جھونکا برداشت کر سکتی ہے اور نہ ہی سیلاب کا دھارا
اور ریل۔ ایک ہی جھکے میں لیٹ جائے گی۔ لہذا ایک دانشور بغیر نیو اور
بنیاد کے دیوار نہیں اٹھاتا۔

حضرات! نیو اور بنیاد ہم نے مانا اور دیوار بھی مگر یہ بتائیے کہ
اگر کہیں اس پر بھت نہ ڈالی جائے تو شہر کانگواں، عمال، محافظ دستہ، آفیس
کے کلرک یہ سب کہاں اور کس طرح اپنی ڈیوٹی انجام دے سکیں گے! اور گری

دعویٰ اور اس کی تیش سے محفوظ رہ سکیں گے۔ اور موسم سرما کی ٹھنڈی لہر اور موسم برسات میں بارش اور اولوں سے بچ سکیں گے؛ اس لئے چھت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ لہذا پتہ چلا کہ ایک کارآمد دروازہ اپنے وجود میں بنیاد، دیوار اور چھت سب کو چاہتا ہے۔

اب آئیے! شہر علم کی بنیاد، دیوار اور چھت کا سراغ لگائیں: حضرات! جب ہم نے واقعات و حقائق کی روشنی میں اس کا پتہ لگایا تو معلوم ہوا کہ خلیفہ اول حضرت سیدنا ابوبکر صدیق اس کی بنیاد بنیاد ہیں۔ اور خلیفہ ثانی حضرت سیدنا امیر المومنین عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کی دیوار ہیں۔ اور خلیفہ سوم حضرت سیدنا امیر المومنین عثمان غنی رضی اللہ عنہ اس کی چھت ہیں۔ اور خلیفہ چہارم حضرت سیدنا امیر المومنین علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کے دروازے ہیں۔

ایک نکتہ

حضرات! ایک دیوار کے اٹھانے میں جو ترتیب پائی جاتی ہے یعنی پہلے نیب بنیاد، پھر دیوار، پھر چھت بعد اور آخر میں دروازہ بس بعینہ اسی ترتیب سے خلافت راشدہ بھی ہے۔

بنیاد پہلے ہوتی ہے تو حضرت سیدنا ابوبکر صدیق کی حیثیت بنیاد جیسی ہے۔ وہ پہلے خلیفہ بھی ہیں۔ اسی طرح اس کے بعد مرتبہ دیوار کا ہے حضرت سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اس کی دیوار ہیں اور خلیفہ ثانی بھی ایسے ہی اس کے بعد تیسرے مرتبہ چھت کا ہے سیدنا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اٹھانے والے اس کی چھت کی مانند ہیں۔ اور خلیفہ سوم بھی۔ آخری مرتبہ دروازے کا ہے اور شیر خدا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اٹھانے والے اس کی حیثیت مانند دروازہ کے ہے۔ اور وہ چوتھے خلیفہ بھی ہیں۔

حضرات! اگر سنجیدگی اور متانت سے حدیث مبارکہ پر غور کیا

جائے تو اسی حدیث مبارکہ میں ترتیب خلافت بھی پائی جاتی ہے۔ گویا اشارہ
کی زبان میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عظیم فتنے کا سد باب کیا
ایک مکان کی تعمیر میں بنیاد، دیوار، چھت، دروازہ میں جو ترتیب پائی جاتی
ہے صدی صدی ہی ترتیب خلافت بھی ہے۔

ایک سوال: اگر کوئی بسکے کہ شہر میں جانے کے لئے ہیں دروازے
کی ضرورت نہیں۔ اس سے پوچھے آخر کیسے جاؤ گے؟ نقب لگا کر، کند
پھینک کر، اچھل کود کے۔ تم اپنے جانے کی ذہیت تو بناؤ؟
پھر حال اگر وہ صدی دروازے کو چھوڑ کر ان میں سے کوئی بھی
صورت اختیار کرتا ہے تو خود اس نے اپنا رشتہ اور تعلق ظاہر کر دیا ایسے
وہ کون لوگ ہیں جو رات کی تاریکی میں کسی دیوار میں نقب لگاتے ہیں، کند
پھینک کر اس کے ذریعہ داخلہ لیتے ہیں۔ سچے کہ کہنا نہیں ہے۔ آپ ذہن
پنزدور سے کر خود ایسے جرم کی کلائی تمام لیجئے تاکہ شریعت اسلامیہ کا قیظ
دستہ اس کے ماتھے میں ہتھکڑی اور پاؤں میں پٹری پہنا سکے۔
پھر تو خود حدیث مفضل بکراں از بی مجلس۔

نکتہ: سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا میں علم کا شہر
ہوں اور علی اس کے دروازہ۔

آپ پر یہ حقیقت واضح رہے کہ عمارت بننے کے بعد دروازہ تعمیر
نہیں کروایا جاتا بلکہ عموماً دروازہ پہلے ہی بنیاد ہوتا ہے۔ معلوم ہوا تیار
رہنا اور رہے اور عمارت میں فٹ کرنا، لگانا، اس کی زینت بنانا اور رہے
اور یہ کام بوقتِ ضرورت ہی ہوتا ہے۔
بس اسی طرح کی مناسبت ترتیب خلافت میں بھی ہے۔

حضرات! شیر خدا علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دروازہ فرما کر
سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے شیر خدا کی قدآور شخصیت کو بہت
ہی ممتاز اور بلند فرما دیا۔

یاد رہے ایوانِ شامی ہو یا سلاطین کا محل، راجاؤں کی کوٹھی ہو یا
کسی تاجدار کا قلعہ معلیٰ ان تمام عمارتوں کا وقار اس کا صدر گہٹ، اور
دروازہ ہے۔ عمارت کے بقیہ حصوں پر اتنی رقم نہیں خرچ کی جاتی جتنا کہ
دروازے پر خرچ کی جاتی ہے۔

حضرات! احادیث مبارکہ کی تشریح کے بعد اب جس آیت کی تلاوت کی گئی اس کے ترجمے اور اس کے متعلقات کی تشریح سے سبکدوش ہو جانا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلے آپ آیت کا مفہوم سماعت فرمائیں۔

خداے وحدہ لا شریک لہ کا ارشاد گرامی ہے کہ:

”اے ایمان والو تم صبر اور نمانے سے مدد چاہو۔ مدد طلب کرو مدد مانگو۔ بیشک اللہ صبر والوں کے ساتھ ہے! اور جو لوگ اللہ کی راہ میں شہید کئے گئے تم انہیں مردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہیں۔“

پہلی بات تو آپ یہ خیال فرمائیں نماز اللہ نہیں، غیر اللہ ہے۔ نماز ارکان مخصوصہ کی ادائیگی اور اس کے مجموعہ کا نام ہے۔ نماز اللہ کے لئے پڑھی جاتی ہے مگر نماز اللہ نہیں، غیر اللہ ہے۔ ایسے ہی صبر بھی اللہ نہیں، غیر اللہ ہے۔ آلام و مصائب اور بے پناہ کٹھنایوں میں رونے دھونے شور و غوغا، آہ و بکا، نالہ و شیون اگر یہ و ماتم کی بجائے صبر و تحمل سے کام لینے کا نام صبر ہے۔ گویا بندے کی ایک مخصوص صفت کا نام صبر ہے۔ مجھے اس مقام پر شفیع جون پوری کا بکرا ہوا کر دار یاد آیا:-

صلاح الدین ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ۸ سال کا نوجوان، ٹھیک عنوان شباب میں وہ داغ مفارقت دے گیا۔ شفیع کا میلاد خواں خاندان سے تعلق تھا۔ ان کے والد انیس خاں جو نیوری بھی محفل میلاد پڑھتے تھے۔ ایک ایک روز میں اٹھارہ بیس پر وگرام، انیس سے تھرتک نظر سے عمر، اور عصر سے مغرب پھر مغرب سے عشاء اور عشاء کے بعد رات اپنی تھی۔ جب تک محافل کا سلسلہ چلتا رہا گھر میں جوان بیٹے کی نعش رکھی رہی مگر شفیع میلاد شریف کے جتنے پر وگرام لے چکے تھے سب کو پورا کر رہے ہیں۔ لوگوں نے کہا نہیں کیا ہو گیا اکلوتے بیٹے کی میت گھر میں

ہے اور تم گھر گھر میلاد پڑھ رہے ہو۔

سینے سے جواب دیا خدا کی دہی ہوئی امانت تھی اس نے لے لیا
اب وہ تو ملنا نہیں پھر اللہ کے رسول کی میلاد شریف کیوں چھوڑی جاتی
ہی وہ مقام ہے جہاں بندے کو صابر و شاکر کہا جاتا ہے۔
معلوم ہوا صبر اور ناز و دوزخ ہی غیر اللہ ہیں۔ اور خود اللہ تعالیٰ ہی اپنے
بندوں کو ان سے مدد مانگنے کو حکم دے رہا ہے۔ اس میں نام نہاد مدعیان
اسلام کے کھوکھلے نعرے کا بھرم کھل گیا جو یہ کہتے ہیں کہ غیر اللہ سے مدد
مانگنا شرک ہے۔ اگر غیر اللہ سے مدد مانگنا شرک ہوتا تو اللہ تعالیٰ اپنے
بندے کو ایسا حکم دیتا ہی کیوں؟

تمہارے کہنے کے بموجب یہ ہوا کہ گویا خود خدا اپنے مومن بندوں
کو شرک کرنے کا حکم دیر رہا ہے۔ العباد باللہ من ذالک۔
لہذا یہاں یہ بات واضح ہو گئی کہ غیر اللہ کو غیر اللہ سمجھ کر اس سے
مدد مانگنا شرک نہیں ہے۔ البتہ غیر اللہ کو معاذ اللہ! اللہ سمجھ کر مدد مانگنا
یہ کھلا شرک ہے۔ لہذا اگر آج سستی مسلمان اللہ کے ولیوں سے استغاثہ
و مدد چاہتا ہے تو انہیں اللہ سمجھ کر نہیں بلکہ اللہ والا سمجھ کر، خدا نہیں
بلکہ محبوب خدا سمجھ کر۔

حضرات! اگر کوئی بیلا وادینا چاہے، بھٹکانا اور گمراہ کرنا چاہے
کہ سورۃ فاتحہ میں تو ہے اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ۔ ہم تجھ
کی عبادت کریں اور تجھ ہی سے مدد چاہیں پھر غیر خدا سے کیوں مدد
مانگی جائے۔ تو آپ اس کی گوشمالی کیجئے کہ اسے عقل کے دشمن! کیا تو ان
لوگوں میں ہے کہ قرآن کے بعض حکموں پر ایمان لایا اور بعض پر نہیں۔ اگر
سورۃ فاتحہ قرآن ہے تو یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوا بِالصَّبْرِ وَ
الصَّلٰوۃِ بھی تو قرآن ہی ہے۔ وہاں بندہ سے کہلوا یا جارہا ہے ہم تجھ ہی

سے مدد چاہیں ہم تجھ ہی سے مدد مانگیں مگر یہاں تو خود خدا بندوں کو حکم دے رہا ہے اسے ایمان والو صبر اور نماز سے جو غیر اللہ میں ان سے مدد مانگو۔

استعانت مصدر ہے، استعین جمع متکلم کا صیغہ ہے اسی استعانت سے استعینوا صیغہ امر ہے وجہ کیا ہے کہ استعین کو مانا جائے۔ اور استعینوا کو چھوڑ دیا جائے۔ کہیں چنیا بیگم نے ابنوں کی گولی تو نہیں کھا رکھی ہے۔

حضرات! اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ مددگار حقیقی پروردگار عالم ہے اور اسی کی بخشی ہوئی قدرت و اجازت سے اللہ کے بندے بھی بندوں کی مدد کرتے ہیں۔

سورہ فاتحہ میں یہ تصور غالب ہے کہ ہم تجھ کو ہی خالق حقیقی اور معبود برحق سمجھ کر مدد مانگتے ہیں۔ اور استعینوا میں حکم دیے کا مقصد یہ ہے کہ غیر اللہ کو غیر اللہ سمجھ کر ہی مدد مانگو اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن اس میں دلائل اور گفتگو کے بعد بھی کوئی کہے کہ غیر اللہ کو غیر اللہ سمجھ کر ہی ان سے مدد مانگی جائے تو یہ شرک ہے تو حضرات میری جرات و بے باکی کو نظر انداز کرتے ہوئے مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ خدا کا یہ حکم عام بندوں کے لئے نہیں ہے بلکہ اس میں مخاطب مومن ہیں۔ لہذا جو مومن ہو گا وہ اس حکم خداوندی کو تسلیم کرے گا۔ بھلا کافر اسے کیوں مانے گا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میں اس کا مخاطب ہی نہیں ہوں۔

فالحمد لله عن ذالک۔

حضرات! آیت کے دوسرے ٹکڑے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کے جائیں تم لوگ انھیں مردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہیں۔

شہدائے کرام کی حیات پر نقص فطمی ہے جس میں شک و شبہ اور ظن

گمان کو کوئی دخل نہیں۔

نکتہ :-

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب خدا نے یہ فرما دیا انھیں مردہ مت کہو تو اس منہی پہلو میں حیات کا مثبت پہلو خود ہی متعین ہو گیا یعنی جب انھیں مردہ نہ کہا جائے گا تو یقیناً وہ زندہ ہیں انھیں زندہ ہی کہا جائے گا۔

لہذا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ان کو مردہ نہ کہنے میں ان کا زندہ ہونا ثابت ہو گیا تو قرآن نے پھر اس قید کا اضافہ کیوں کیا؟ ”بل احوار“ بلکہ وہ زندہ ہیں۔

حضرات! میں برابر عرض کر چکا ہوں کہ نزول قرآن میں مزاج انسانی اور اس کی نفسیات کا بھرپور لحاظ رکھا گیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو قرآن انہم انسانی سے دور ہو کر چیتاں اور پھیلی ہو جانا۔ اور یہ قرآن کے مقصد ہدایت کے منافی ہے۔

دیکھئے اس سلسلے میں ہمارا اور آپ کا مزاج ایسا واقع ہوا ہے کہ ہم اور آپ دیکھتے ہیں کہ اندھا ہے مگر بتقاضے ادب اندھے کو اندھا کانے کو کاننا، لنگڑے کو لنگڑا نہیں کہتے۔ اس نہیں کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ کاننا نہیں ہے۔ لنگڑا نہیں ہے اور عیسیٰ نہیں ہے یعنی ہے تو کاننا مگر کہو مت۔ ہے تو اندھا مگر کہو مت، ہے تو عیسیٰ مگر کہو مت ایسے ہی اگر قرآن صرف اتنا ہی کہہ کر گزر جاتا کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے جائیں انھیں مردہ مت کہو تو یہ شبہ پیدا کیا جاسکتا تھا کہ وہ مرنے والے ہیں مگر چونکہ خدا کی راہ میں مارے گئے ہیں لہذا احتراماً انھیں مردہ مت کہو۔ اس شبہ کے ازالے کے لئے خدا نے یہ فرما دیا کہ ”بل احوار“ بلکہ وہ واقعاً زندہ ہیں۔ اگر میت کی یہ قید نہ ہو تو حیات شہداء مشکوک و

مشتبہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ ”بل اجبار“ کی مثبت قید نے شہدائے کرام کی حیات پر اب ایسی ہر گادی جس سے ان کی حیات کا انکار قرآن کے انکار کا مترادف قرار پائے گا۔

اب یہاں ایک دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ زندہ ہیں تو نظر کیوں نہیں آتے۔ ملتے جلتے کیوں نہیں؟ ان سے مصافحہ و معانفہ کیوں نہیں ہوتا وغیرہ وغیرہ۔

حضرات! گلے کی رگیں پھلا کر سوال کرنا تو بہت آسان ہے، لیکن مسائل کی گہرائیوں میں اترنا سب کے بس کا کام نہیں۔ بقراط زمانہ کہتے تو ہیں کہ وہ ملتے جلتے کیوں نہیں؟ لیکن اگر کبھی ایسا ہی ہو جائے تو جناب ہی کا ہارٹ فیل ہو گا۔ مثلاً آپ کی آبادی میں اگر کوئی شہید ہو جائے دیوار کے گر جانے سے پانی میں ڈوب جانے سے وغیرہ وغیرہ۔ اور بعد نماز ظہر آپ دفنادیں لیکن عصر بعد آفتاب ڈوبتے ڈوبتے وہی شہید آپ کے دروازے پر آ کے کھڑا ہو جائے، آبادیوں میں ٹہلنے گھومنے لگے تو نہ تو اس سے کوئی سلام کرنے آئیگا اور نہ ہی مصافحہ و معانفہ کرنے آئے گا۔ گھر کا دروازہ بند کر دیا جائے گا! درجوں کو گھر کی کالی کوٹھری میں بند کر دیا جائے گا۔ اس وقت جتنے معنویاتی بات۔ یہ موت کہاں سے آگیا۔ یہ زندہ کیسے ہو گیا یہ شیطان تو نہیں ہے۔

معلوم ہوا کہ یہ ایک نظام قدرت ہے۔ اسی لئے اس شبہ کے ازالے کے لئے قرآن نے یہ کہا ”لکھ لا تشعرون“ یعنی شہید زندہ تو ہے مگر اب وہ ایسی زندگی میں ہے کہ تم کو اس کا شعور نہیں۔ یہ قید اسی شبہ کا جواب ہے یعنی ”بل اجبار“ نے ان کی حیات حقیقی پر ہر گادی اور

ولکن لا تشعرون کی قید نے ذہنی اختراع کے مزمومات کا بطلان ظاہر کر دیا۔

ہو سکتا ہے کہ اس واضح گفتگو کے بعد کوئی اڑیل گھوڑا کی طرح ہی کہے جائے۔ ایسی زندگی کس کام کی کہ زندہ ہو مگر دیکھنے میں نہ آئے تو حضرات اب آپ کتب خانہ کی سیر نہ کریں بلکہ یہیں بیٹھے رہیں مسئلہ حل کئے دیتا ہوں مسلمان ہونے کے ناطے ہم یہ بات کہتے ہیں کہ ہمارے دونوں کاندھے پر دو فرشتے ہیں جو ہماری نیکی و بدی لکھا کرتے ہیں۔

اب میں آپ لوگوں سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ لکھنا یہ مردے کا کام ہے یا زندہ کا۔ یقیناً آپ کا یہی جواب ہو گا کہ زندے کا ہو گا۔ معلوم ہوا کہ فرشتے کا وجود بھی ہے اور وہ زندہ بھی ہیں جب ہی تو وہ ہماری نیکی بدی لکھتے ہیں۔ اب میں آپ ہی سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اگر ہر زندہ کو دیکھنا ضروری ہے تو اپنے کاندھے کے فرشتے سے کتنی بار ملاقات کی آپ نے کتنی بار مصافحہ و معانفہ کیا۔ کتنی بار مہمان نوازی کی ہے۔؟

معلوم ہوا کہ فرشتے کا وجود بھی ہے اور زندہ بھی۔ مگر انھیں دیکھ نہیں پاتے۔ یعنی اللہ کی مخلوقات سے بعض ایسی مخلوق ہے کہ اس کا وجود ہے اسے ہماری آنکھ دیکھ نہیں پاتی۔ پس ایسے ہی شہدائے اسلام پر اللہ تبارک و تعالیٰ کا یہ انعام و اکرام ہے کہ جب تک انھوں نے یہ قربانی نہیں دی تھی انھیں لباس کثیف پہنایا گیا تھا۔ اور جب انھوں نے جہان جیسی پیاری دولت کو خدا کی راہ میں قربان کر دیا تو اب خدا نے انھیں ایسا لطیف لباس پہنایا ہے کہ وہ زندہ ہیں مگر ہماری آنکھوں کی گرفت میں نہیں آتے۔ ذالک فضل اللہ جو تبتہ من یشاء و لا یستثنیٰ

ذُو النُّصْل العَظِیم

منصب ولایت

الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفَى وَسَلَامٌ عَلَى حَبِيبِهِ الَّذِي
اضْطَلَقَ اَمَّا بَعْدُ !

فَاعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلَا اِنَّ اَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ
وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا

يَتَّقُوْنَ ۝

ملنے کی یہی راہ نسلے کی یہی راہ

دنیا جیسے کہتے ہیں عجب راہ گزر رہے

حضرات! آج میری تقریر کا عنوان ہے ”منصب ولایت“

نہ پوچھو ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھو ان کو

پر بیٹھا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

چونکہ آج مجھے اللہ کے ان برگزیدہ بندوں اور قدسی نفوس

ہستیوں کا ذکر کرنا ہے جن کو ہم ہنر گانِ دین اور اللہ کا ولی کہتے ہیں

اس لئے قرآن کریم کے گیارہویں پارہ کی ایک ایسی آیت مبارکہ کی تلاوت

کی ہے جس میں خدا نے ذوالجلال نے انھیں قدسی صفات کا ذکر کیا ہے

اَلَا اِنَّ اَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ الَّذِيْنَ

اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝

تلاوت کی ہوئی آیت کا مفہوم یہ ہے کہ: متنبہ ہو جاؤ، بے شک اللہ کے دلیوں کے لئے نہ کوئی علم ہے نہ حزن و ملال۔ وہ ایسے لوگ ہیں جو ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کیا۔

ایک نکتہ:-

حضرات! عام اصول یہ ہے کہ پہلے کسی شے کی تعریف کی جاتی ہے پھر اس کے احکام یا محاسن و فضائل بیان کئے جاتے ہیں مگر قرآن نے یہاں ترتیب بدل دی ہے۔ ہونا یہ چاہئے تھا کہ پہلے ولی کی تعریف بیان کی جاتی، پھر ان کے محاسن و اوصاف۔ لیکن آیت میں پہلے ان کے علوئے مرتبت، درجات و مراتب، فوقیت و برتری کا اعلان، و اظہار ہے کہ وہ ہیں کہ انہیں کوئی خوف نہیں اور انہیں کوئی ملال نہیں۔ یہ ولی کی تعریف نہیں ہے بلکہ عام انسانوں سے ان کی جداگانہ حیثیت کا اعتراف اور اس کا اظہار ہے۔ اس کے بعد کے ٹکڑے میں ان کی تعریف ہے کہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کیا۔

حضرات! آپ سوچ رہے ہوں گے کہ ایسا کیوں ہے؟ میں نے اور بھی کہیں آپ کو بتایا ہے کہ قرآن کی ترتیب بے معنی نہیں ہوتی۔ بلکہ اس میں بھرپور معنویت ہوتی ہے۔

یہاں ترتیب بدلنے کا فائدہ یہ ہے کہ جب قرآن یہ کہے گا کہ یہ وہ مقدس گروہ ہے جس پر سے علم اور ملال اٹھالیا گیا ہے تو انسانیت کے کان کھڑے ہو جائیں گے کہ پوری دنیا نے اسلام خوف اور امید کے درمیان ہے۔ ”الایمان بن الخوف والرجاء“

مگر وہ کون سے مقبول و محبوب بندے ہیں جن سے خوف و ملال اٹھلے؟ عام لوگوں سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔ ترتیب بدل دینے کی وجہ سے شوق پیدا ہو گا، نیک پیدا ہو گی، رعزت اور جارت ہو گی۔

بند پروردگار عالم عام بندوں کو اپنے محبوبوں کے ذکر اور ان کی یاد کی طرف شوق دلانا چاہتا ہے کہ دل کی تڑپ اور ذہن و فکر کے جھکاؤ کے ساتھ ان کی طرف دوڑو۔ اور ان کا ذکر سنو، بے دل اور بے رخی سے نہیں بلکہ وارفتگی شوق سے ان کی بارگاہ کرم تک پہنچو۔

آیت کی ابتدا "آلَا" سے ہے جس کے معنی ہیں "متنبہ ہو جاؤ!" ہوشیار ہو جاؤ۔ خبردار ہو جاؤ۔ جہاں کہیں، جب کبھی کسی حکم و ذکر کا اہتمام مقصود ہوتا ہے اور اس کی اہمیت بتانی ہوتی ہے تو قرآن کا مزاج بھی ہے کہ وہ ایسے حروف سے بیان کی ابتدا کرتا ہے کہ سننے والے کا ذہن فوراً اس کی طرف منتقل ہو جائے تاکہ پوری یکسوئی اور دل کی لگن سے آنے والے حکم یا بیان کو سن سکے۔

"آلَا" سے ابتدا کر کے پروردگار عالم کا یہ بھی اشارہ منظور و مقصود ہے کہ یہ کسی ایسے غیرے اور معمولی لوگوں کا ذکر نہیں ہونے جارہا ہے بلکہ میرے ان چہیتے اور محبوب بندوں کا ذکر ہے کہ اگر تم ان سے قریب ہو گے تو گویا اللہ سے قریب ہو گے۔ حضرات! یہیں پر یہ گوشہ بھی حل کر لیں تو آگے بڑھیں تاکہ آیت کا مفہوم کسی حد تک واضح ہو جائے۔ پھر اس مسئلہ کو نکات اور واقعات کے آئینے میں دیکھا بھالا جائے۔

نکتہ :- سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان سے خوف اور حزن و ملال کیوں اٹھا لیا گیا۔

حضرات! آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس باب میں سنت الہیہ کچھ ایسی ہے کہ جو نہیں ڈرتا اسے ڈرایا جاتا ہے۔ اور جس نے ڈرنے کا حق ادا کر دیا اس پر سے خوف اور ملال کو اٹھا لیا جاتا ہے۔ چنانچہ اللہ کے یہ برگزیدہ بندے جن کا دل ہمیشہ خشیت الہی سے معمور و سوز

وگداز کی دھڑکنوں سے بیدار اور رضاے الہی کی تجسس و تلاش میں آنکھیں اشکبار رہتی ہیں۔ پھر ان پر انعام الہی کی موسلا دھار بارش جتنی کہ اللہ کے وہ عام بندے جو خوف اور حزن و ملال کی آہنی زنجیروں میں جکڑے رہتے ہیں، اس قید و بند سے انھیں نیکمر رہائی مل جاتی ہے، کہ اب انھیں نہ تو اپنے ماضی کا غم رہتا ہے اور نہ ہی مستقبل کا ملال۔ غم کا تعلق ماضی سے ہے اور ملال کا مستقبل سے۔

انعام الہی کے یہ اثرات و نتائج اس حد تک مؤثر ہوتے ہیں کہ جو ان سے قریب ہو جاتا ہے ان کے دلوں میں خوف و ڈر جاتا رہتا ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ حضرت رابعہ بصریہ کی بکریاں شیروں کے ساتھ پنگھٹ اور چشے پر پانی پیتی تھیں۔ حیرت زدہ لوگوں نے سوچا کہ شیر اور بکری کا گٹھ جوڑ کیسا؟ اس کا پانی کے ایک ہی چشمہ پر پانی پینا کیسا؟ شیروں کو انھیں پھاڑ ڈالنا چاہئے۔ اور بکریوں کو انھیں دیکھ کر خوفزدہ اور نروس ہو جانا چاہئے، لیکن یہ کیا ماجرا ہے کہ دونوں شیر و شکر ہو کر پانی پیتے ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ جو خوف الہی اور خشیت ربی کے صحیح مفہوم سے ناواقف و نا آشنا تھے انھوں نے اللہ کی ولیہ حضرت رابعہ سے دریافت کیا کہ اے رابعہ تمہاری بکری نے شیر سے کب سے دوستی کر لی ہے؟

حضرت رابعہ نے جواب دیا جب سے رابعہ نے اللہ سے دوستی کر لی ہے۔

آپ اس کی تفصیل تو آئندہ ملاحظہ فرمائیں گے کہ اس دوستی کے اثرات و ثمرات و نتائج کیسے کیسے ہیں؟ کس کس روپ میں ہیں یہ ایک ضمنی اور ذیلی بات تھی جو چلتے ہوئے مضمون سے لگی بندھی معلوم ہوئی اس لئے اس کا ذکر کر دیا۔

حضرات! اگر آیت کا صحیح مفہوم ذہن میں آکر گیا ہو تو اب اصل عنوان سے وابستہ ہو جائیں۔ میرا موضوع ہے "منصب ولایت" جس طرح صفہ انسانیت میں نبوت و رسالت ایک منصب ہے، ایسے ہی ولایت بھی ایک منصب ہے۔ فرق یہ ہے کہ نبوت و رسالت کا منصب اعلان و اقرار لینے کا ہے یہ نبی کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی قوم اور اللہ کے بندوں میں اعلان کرے کہ میں اللہ کا نبی و رسول ہوں۔ یہ اعلان ہے، اور اس کے ساتھ بھرتے بھی ہے کہ تم لوگ میری نبوت و رسالت پر ایمان لاؤ۔ یہ اقرار لینا ہے۔ یاد رہے کہ نبی و رسول اس اعلان و اقرار میں تواضع و انکسار سے کام نہیں لے سکتے۔

مثلاً اگر اللہ کے کسی بندے نے کہا کہ آپ نبی و رسول ہیں، سبحان الدعوات ہیں، خدا کی بارگاہ میں آپ کا رتبہ و مرتبہ بہت ہی بلند و بالا ہے خدا آپ کی باتوں کو سننا اور قبول فرماتا ہے تو نبی و رسول ہرگز ہرگز بطور تواضع و انکسار کبھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ نہیں نہیں مجھے ایسا نہ کہو، نبی و رسول نہ کہو۔ میں تو ایک معمولی درجہ کا بشر ہوں۔ معاذ اللہ!

چونکہ یہ منصب رسالت اعلان، اظہار اور اقرار لینے کا ہے، لیکن منصب ولایت اعلان و اظہار کا نہیں بلکہ چھپانے کا ہے اس کا ڈنکا نہیں پیٹا جاتا۔ اور نہ ہی اس کا چرچا کیا جاتا ہے، نہ خود اس کا اعلان کرے اور نہ ہی مریدین کے اعلان کو پسند کرے، ان پر سختی سے پھرہ بٹھائے اس لئے کہ ان باتوں سے نفس موٹا ہوتا ہے، غرور و پنہا جنم لیتا ہے اگر وہ راہ پر لگا ہوا ہے تو ترقی درجات کے راستے مسدود ہو جائیں گے اور صرف کھوکھلا میل ہو کر رہ جائے گا شیطان کے ایڑ مارنے کے بہت سے راستے ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے۔ حتیٰ کہ صوفیاء اہل اللہ فرماتے ہیں کہ دلی کو اپنی کرامت ایسی ہی چھپانی چاہئے جیسے خاتون عورت اپنے کرم

یعنی حیض کے کپڑے کو چھپاتی ہے۔ معلوم ہوا یہ منصب اعلان کا نہیں، بلکہ چھپانے کا ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ بعض سادہ لوح حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ دلی وہ ہے جس سے کرامت کا صدور و اظہار ہو۔ اس راہ میں یہ ایک بہت بڑی بنیادی غلطی اور دھوکہ ہے۔

چنانچہ حضرت جنید بغدادی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بارگاہ میں ایک عقیدت مند مرید ہونے کی غرض سے حاضر ہوا۔ اور مسلسل تیس برس حضرت کی خدمت میں لگا رہا۔ اب ایک دن ایسا آتا کہ اس نے اپنا رخت سفر باندھا۔ بوسہ بستر سنبھالا اور حضرت کی خدمت میں اجازت طلب کرنے کی غرض سے آیا۔ سلطان الاولیاء حضرت سیدنا جنید بغدادی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ”کیسے آئے اور کیسے چلے“ انہی دونوں تک رہے مگر آج تک تم نے اظہار مدعا تک نہ کیا۔

اس نے عرض کیا حضور مرید ہونے کی غرض سے حاضر ہوا تھا مگر آج میں مایوس ہو کر جا رہا ہوں۔ میری امیدوں کا چراغ بجھ گیا۔ اور آرزوؤں نے آپ کی چوکھٹ پر دم توڑ دیے ہیں۔ تمنائیں اس درپشتہ تکمیل ہی رہ گئیں۔ اجازت دیجئے کہ تہہ بوس ہو کر کسی اور آستانے کی تلاش میں لگ جاؤں۔

حضرت نے فرمایا کہ ایسی کیا بات ہے، کچھ اس کی تفصیل تو سنو؟ اس نے عرض کیا حضور! آج تک اس ٹوہ میں لگا رہا کہ کوئی کرامت دیکھو لیتا تو مرید ہو جاتا۔ مگر اس طویل عرصے میں، میں نے کوئی ایسی بات نہ دیکھی جسے دل کرامت سمجھ کر جھک گیا ہوتا۔

حضرت نے مسکراتے ہوئے فرمایا ”یہ سچ ہے کہ تم نے نہیں

ہواؤں میں اڑتے نہیں دیکھا، نہ ہی سبیل دریا پر مصلیٰ بچھا کر نماز پڑھتے دیکھا۔ اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا "مگر یہ تو بتاؤ کبھی میرا قدم ایسا بھی اٹھا ہو جو خلاف سنت ہو اور میری زبان پر کوئی ایسا لفظ بھی آیا جو فرمان نبوی کے خلاف ہو؟"

یہ سنتیں ہی اس کے دل کا دروازہ کھل گیا، آنکھیں ساون بھادوں کی طرح جھڑنے لگیں اور پھر گلو گلو اور گرفتہ آواز میں اس نے عرض کیا اپنا دستِ کرم بڑھا کر اپنی غلامی میں لے لیں۔

حضرت نے فرمایا، یہ بہت بڑی بنیادی غلطی ہے، کہ لوگوں نے کرامت کو "معیار ولایت" سمجھ رکھا ہے بلکہ اتباع سنت ہی معیار ولایت ہے۔ جو جتنا ہی متبع سنت ہو گا اسی قدر اسے قرب الہی حاصل ہو گا۔

یاد رہے تصوف کسی خاص لباس، گیر و بستر، اور رنگیلے شاہ کا نام نہیں ہے۔ اگر کسی خاص لباس کا پابند ہو تو اس سے ملنے کا بہت آسان نسخہ ہے۔ آپ دھوکہ میں نہ آئیں۔ میں اپنے آپ کو زمزم و سلسبیل میں دھلا دھلا یا تصور نہیں کرتا۔ گناہوں سے آلودہ، اور معصیت میں غرق زندگی کو بھلا کیا حق جو اللہ کے ان پاکیزہ بندوں پر نقد و نظر کرے۔ ابھی تو اسے خود اپنی اصلاح کرنی چاہئے ہر حال! میں تو اس توفیق الہی پر بھی سجدۂ شکر ادا کرتا ہوں۔

کہ خود بینی و خود پسندی کے روگ میں مبتلا نہیں، بلکہ اصلاح نفس کے لئے تاریک دل کا دروازہ کھلا ہے۔ شاید کہ یہی جذبہ طلب کبھی کام آجائے۔ میری آنکھوں پر پٹی نہیں بندھی ہے۔ میں اسے جانتا ہوں کہ پہلے مجھے اپنے نفس کا محاسبہ کرنا چاہئے۔ لیکن چالیس برسوں کی زندگی میں نے صرف سیر و تفریح میں نہیں گزار دی بلکہ جہاں گیا ایکشن اور پروگرام

کے ساتھ گیا۔

نجم آباد میں بریلوی کہا گیا چونکہ اپنے اور بیگانے سمجھی جانتے تھے کہ یہ اپنا وطن لے کر نہیں آیا بلکہ بریلی کے تاجدار، امام المسنت، سیدنا امام احمد رضا فاضل بریلوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا شن لے کر آیا ہے۔

جب میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ ہاتھوں کی انگلیوں میں بجائے ایک کے کئی کئی انگوٹھیاں ہیں وہ بھی مختلف دھات کی ہیں بلکہ بعض بعض حضرات کی ایک ایک انگلی میں کئی کئی انگوٹھیاں۔ حالانکہ سرکار نے فرمایا، انگوٹھی صرف چاندی کی پہنی جائے وہ بھی ساڑھے چار ماشہ سے زائد نہ ہو جب کہ شریعت اسلامیہ نے ایک ایک چیز کی حد بندی کر دی ہے۔ پھر ان حدود سے تجاوز نہ ہونا، وہ بھی کہیں اور نہیں مٹا لٹا ہی زندگی میں سے

عز جو کفر از کعبہ بر حیث نزدیکی ماند اسلامی

ایسے ہی "بال" جس میں چونٹیاں گوندھی جائیں۔ میں جانتا ہوں چھوٹا منہ بڑی بات والی مثال صادق آ رہی ہے لیکن خدا مجھے معاف کرے۔

بہر حال! گذارش یہ ہے کہ اللہ کی معرفت لباس یا عقل، اور کھوپڑی میں نہیں، اس کی جگہ ایک اور صرف ایک ہے اور وہ ہے دل۔ جب رحمت باری اپنے کسی مخصوص بندہ کو نوازی ہے تو اس کی تجلیات کا کاشانہ اور شہین صرف "دل" ہوتا ہے۔ یہیں اس کی تجلیات آتی ہیں اور یہیں سے پھوٹتی ہیں۔

میں اسی نے کبھی کبھی درس گاہ اور خانقاہ کا فرق بیان کرتے ہوئے یہ عرض کرتا ہوں "درس گاہ میں پڑھایا جاتا ہے اور خانقاہ میں پلایا جاتا ہے" اس کی بحث کہیں گزر چکی۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ درس گاہ میں عقل مانگی جاتی ہے اور خانقاہ میں
دل صیقل کیا جاتا ہے۔ چونکہ دل کا برتن عقل ہے اور معرفت الہی کا آبگینہ
دل ہے۔ اس لئے ایک عالم ظاہر طالب علم کی عقل کی دھار کو تیز کرتا ہے
اور عالم باطن دل کو جلا دیتا ہے۔ وہاں علم آئے گا، یہاں معرفت آئے گی
اور تیسرا فرق یہ ہے کہ اگر درس گاہ میں کوئی دیوانہ داخلہ لے تو
اسے دانا بنایا جاتا ہے۔ اور اگر خانقاہ میں کوئی دانا آئے تو اسے دیوانہ
بنایا جاتا ہے۔

دیکھو! ہماری درس گاہ دارالعلوم غریب نواز میں طالب علم
اپنے اسناد سے سوالات پر سوالات کرتا ہے۔ جیسے ہی استاد نے
پڑھا یا الکلمۃ۔ فوراً طالب علم سوال کرنا شروع کر دے گا۔
حضرت! یہ کلمہ پرالف لام کیسی ہے؟ استغراق کلمہ ہے، یا عہد خارجی ہے
عہد ذہنی ہے یا عہد جنسی ہے یا تحسین کلام کے لئے ہے اگر وہ ہے تو
یہ کیوں نہیں؟ یہ ہے تو وہ کیوں نہیں؟ اور آخر کی "ة" کیسی ہے،
لفظ کلمہ کس سے مشتق ہے؟

سوالات کی بوچھاڑ میں استاد جواب دیتا جا رہا ہے۔ ایک منہجا
منہجایا، تجربہ کار اور لائق و فائق مدرس کبھی طالب علم پر نہ تو کوئی بندش
لگائے گا اور نہ ہی اپنے علمی رعب و جلال کا پہرہ بھٹائے گا۔ بلکہ اس
کی ذکاوت و خطابت کو داد و تحسین دیتے ہوئے اس کی حوصلہ افزائی
کرے گا تا کہ خوب خوب بولے اور خوب خوب سمجھے۔ اگر یہ آج ہمارے
یہاں نہ بولے گا تو کل میدان مناظرہ کیسے جیتے گا۔ اسے مدرس بھی ہونا
ہے، مفتی بھی، صاحب قلم اور صاحب زبان بھی۔ مقرر اور مناظر بھی
گو یا یہ ایک درس گاہ بھی ہے اور تربیت گاہ بھی۔
یہ وہ تربیت گاہ ہے جہاں دیوانہ کو دانا بنایا جاتا ہے اس کے

برخلاف اگر کوئی شخص سیدی سرکار مفتی اعظم رضی اللہ عنہ سے داخل سلسلہ عالیہ رضویہ ہوا۔ اور حضرت یہ فرماتے کہ روزانہ بعد نماز فجر ۴۱ بار اول و آخر درود شریف کے ساتھ مرحمت پڑھ لیا کرو۔

اب وہ عرف کرنا حضور! ۴۱ بار کیوں؟ ۴۰ بار کیوں نہ پڑھ لیا کریں؟ تو حضرت اسے شاباش نہیں دیتے بلکہ مسکراتے ہوئے فرماتے۔ بھول ہو گئی مرید تم کو نہیں مجھ کو ہونا چاہیے تھا۔ اس لئے کہ یہ درس گاہ نہیں ہے خانقاہ ہے، یہاں دانا نہیں دیوانہ بنایا جاتا ہے بگرایا دیوانہ جس پر ہزار ہا فرزانگی قربان۔

پھر حال گفتگو یہ چل رہی تھی کہ عالم ظاہر عقل کی قلعی کرتا ہے، اور عالم باطن دل کو صیقل کرتا ہے۔

حضرات! اتنی بڑی تعداد میں آج مخلوق الہی ان بندگان خدا کے آستانہ جات پر حاضری دیتی ہے۔ آخر وہ کون سی کشش اور مقناطیت ہے کہ لاکھوں انسانوں کا میلہ چھٹی رجب کو میرے غریب نوان کے یہاں لگ جاتا ہے۔

نکتہ :- یہ ہم میں رہے مگر ہماری طرح نہیں رہے۔ ہم دل بدلی میں لگے رہے اور یہ دل بنانے میں رہے۔ یہ مقام و مرتبہ انھیں صرف کپڑا پہننے سے حاصل نہیں ہو گیا۔ بلکہ اس دل کو عشق الہی کی بھٹی میں سلگا رہے۔ یہ دنیا مقام عبرت ہے مگر اس سے ہم سبق حاصل نہیں کرتے۔ دیکھئے ہمارے گھروں میں تانبے کی پتیلی ہوتی ہے۔ بد توں بغیر قلعی پڑی رہتی ہے۔ ہمارے بوبی کا رد لاج یہ ہے کہ بچیوں کی شادی میں تانبے کے برتن بغیر قلعی ہی دیئے جاتے ہیں۔ اس کی مصلحت یہ ہے کہ اگر اس برتن قلعی کر دی جائے تو یہ صحیح اندازہ نہ ہو سکے گا کہ یہ نیا برتن ہے یا پرانا اس لئے اس پر قلعی نہیں کراتے۔

برسوں کی زنگ آلود پتیلی گھر میں رکھی ہے۔ اب اسے استعمال کی ضرورت
 پرگئی تو آب بغیر قلعی کے اسے استعمال نہیں کر سکتے۔ ورنہ کھانے میں سمیت
 آجلے گی۔ زہر کا اثر آجائے گا۔ لہذا آپ کہاں گئے؟ قلعی گر کے پہاں۔
 قلعی گر پتیلی کو لے کر فوراً قلعی نہ کر دیتا بلکہ اس کے پہاں چند جوان بچے ملازم ہیں
 یہ پتیلی اس کو دیدیتا ہے اور رٹ کے اس میں ”جھاواں“ زیادہ پکی ہوئی اینٹ
 کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو ڈال کر اور اس پر وہیں کپڑے کو بھاتا ہے،
 پھر اس میں دونوں پاؤں ڈال کر اسے پاؤں سے رگڑتا اور مانتا ہے۔
 گو یا پتیلی دیدہ دروں کے لئے مقام عبرت بن کر اپنی خاموش زبان میں یہ
 کہہ رہی ہے کہ اے لوگو مجھ سے سبق حاصل کرو۔ کہ جب میں نے یہ چاہا کہ میں
 چمک جاؤں تو مجھے کسی کے پاؤں کی ٹھوکر میں آنا پڑا۔ پائمال کی جا رہی ہوں
 رزمی جا رہی ہوں، ٹھکرائی جا رہی ہوں۔ چونکہ مجھے چمکنا ہے۔ پھر وہ
 جوان بچے اس پتیلی کو قلعی گر کے سپرد کرتے ہیں۔ قلعی گر واپس کر دیتا ہے
 کہ ابھی اس کا زنگ نہیں چھوٹا۔ زنگ اور قلعی اکٹھا نہیں ہوتے۔ اس کو
 اور مانجو۔ پھر پاؤں کی ٹھوکر میں گئی۔ اب قلعی گر چھو منتر کے ذریعہ اسے
 نہیں چمکاتا بلکہ آگ کی بھٹی میں ڈال دیتا ہے وہ دیر تک انگاروں اور
 شعلوں پہ سلگتی ہے۔ جب خوب دھک جاتی ہے تو قلعی گر تھوڑا سا رانگا
 پھر دیتا ہے۔ اس کو اور جلا دینے کے لئے آمیزش کر دیتا ہے۔ اب وہی
 جو زنگ آلود تھی اس کی آب و تاب پر آنکھ نہیں ٹھہرتی۔

آپ جیسے دانشوروں نے سمجھ لیا ہو گا کہ پتیلی جب چمکنا چاہتی
 ہے تو ہزار مصلبتوں سے گزرنے کے بعد تب کہیں قابل استعمال ہوتی
 ہے۔

کننے عالم ہیں کہ غنچوں پہ گزر جاتے ہیں
 تب کہیں جا کے وہ رنگین قبا ہوتی ہے

بس ایسے ہی جب اللہ کا ایک بندہ یہ چاہتا ہے کہ یہ دل انوار الہی سے بھرتی و مصطفیٰ ہو جائے یہ سینہ اس کی معرفت کا گنجینہ بن جائے اور اس کی سانس یاد الہی کا نمود بن جائے تو قدرت اشارہ کرتی ہے کہ یہ مقام ایسے نہ حاصل ہوگا۔ بلکہ پہلے اپنے آپ کو عشق الہی کی بھٹی میں ڈال دو۔ کسی اللہ والے کے آستانہ کی درپوزہ گری کرو۔

جب کوئی ان منزلوں سے گزر جاتا ہے تو پھر دل خاک کندن بن کر چمکے لگتا ہے۔

سلطان المشائخ حضرت نظام الدین محبوب الہی رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ ماجدہ کچھ روٹیاں پکا کر آپ کو دیدیتی ہیں۔ اور سلطان المشائخ اسے لے کر آبادی سے باہر کہیں چلے جاتے اور دن رات اللہ کی یاد میں لگے رہتے۔ ذکر و فکر میں رہتے اور انھیں خشک روٹیوں پر گزارہ کرتے پھر آتے اور روٹیاں لے کر چلے جاتے۔

بطور آزمائش ایک بار آپ کی والدہ نے فرمایا: بیٹے قریب آؤ تمہارے بال بڑھ گئے ہیں۔ دیکھیں اس میں جوئیں تو نہیں پڑ گئیں ہیں؟ ماں نے شہزادے کا سر زانو پر رکھ لیا اور سر کے بال کو چٹکیوں سے لے کر کچھ زور سے کھینچا تو آپ نے آہ اور اُف کیا۔ ماں نے یہ کہہ کر زانو سے سر ہٹا دیا کہ شہزادے تمہیں ابھی اپنے جسم کی تکلیف کا احساس باقی ہے۔ اسے یاد الہی میں اتنے مستغرق ہو جاؤ، ڈوب جاؤ کہ بدن کی تکلیف کا احساس تک نہ رہے۔

اسی طرح آتے جلتے والدہ محترمہ نے پھر امتحان لیا، دسترخوان کچھ طرح طرح کی نعمتوں سے چُمن دیا۔ سامنے بجائے وہی کے چونا رکھ دیا۔ آپ نے اسے دہی سمجھا اور زناوُل فرمایا۔ آپ کو یقین ہو گیا کہ بیٹے کو اب زبان کی لذت و چٹنی رہے گا احساس ختم ہو گیا۔

حضرات اس طرح مال نے اپنے صاحبزادہ کی تربیت کی اور اس کے دوست کو امتحانات کی مختلف منزلوں سے گزرنا پڑا۔ تب فرمایا جاتا ہے اب ان کے لئے غم نہیں اور کوئی ملال نہیں۔

معلوم ہوا طریقت کی راہ میں ساری کائنات یہ دل ہے! یہی لئے آقائے دہر جہاں نے اسی کی اصلاح پر زور دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد نبوی ہے: **إِنَّمَا فِي جَسَدِ الْإِنْسَانِ مُضْغَةٌ إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ** (الوحی) القلب سرکار فرماتے ہیں کہ تمہارے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ اس کی اصلاح ہوگئی تو گویا پورے بدن کی اصلاح ہوگئی اور اگر اس میں فساد ہو گیا تو گویا پورا بدن بگڑ گیا وہ دل ہے۔ بھلا وہ کس کام کا جو تن کا اجلا اور من کا کالا ہو۔ اسی خطرے کے پیش نظر کسی نے کیا خوب کہا ہے: **یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مر جائے**

کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

اسی لئے تصوف کی روح اور طریقت کی جان قلب کی تہن اور ہاکیزگی ہے جس نے اسے سنوارا وہ سنور گیا، جس نے اسے بگاڑا وہ بگڑ گیا۔

اب آئیے دل کی مثال ملاحظہ فرمائیے:

نکتہ: حضرات! دل کی مثال موم جیسی ہے جس طرح موم کا ایک ٹکڑا ہمارے اور آپ کے ہاتھوں کا گویا کھلونا ہوتا ہے چم جاہیں تو اسے کیند بنالیں، چاہیں شیش بنالیں۔ اگر دل چاہے تو اسے مکد بنالیں۔ پٹری اور گلاس بنالیں۔ غرض کہ جس شکل و روپ میں ڈھالنا چاہیں ڈھال لیں۔

بس کچھ اسی طرح قلب انسانی بھی خواہشات نفس کا کھلونا ہے

اس کے اشارہ پر پتہ کی طرح ڈولتا رہتا ہے۔ اسے کہیں قرار نہیں بغیر
کہے ادھر جائے۔ جیسا کہ دیکھا کرے۔

لیکن موم میں صرف ایک بار یک سادھا گڑا ل دیکھو۔ تو اب
اس کی شکل بدل گئی۔ اس کا نام بدل گیا۔ اب اسے موم نہیں کہتے بلکہ اسے
”موم بتی“ کہتے ہیں۔ اب اس میں سختی اور توانائی آگئی۔ اسی طرح یہ دل
خواہشات نفسانی کا کھلونا تو ہے مگر جب سوزنا اور بننا چاہتا ہے
تو اللہ کے کسی ولی کا دامن تھامتا ہے۔ وہ مرشد کامل اپنی عقیدت
و محبت کے دھارے میں اسے منسلک کر لیتا ہے۔ اب یہ دل آزاد نہیں
رہ گیا۔ یہ چھٹرا دبے لگام نہیں رہا۔ بلکہ پیر کی محبت کے دھارے میں
گرفتار ہو گیا۔

حضرات! موم میں دھواگال لگایا تو اب وہ موم نہیں ”موم بتی“
ہے مگر یہ تو بتائیے کیا موم بتی اسی لئے بنائی گئی ہے کہ اسے آہنی الماری
یا بخوری میں رکھا جائے! یقیناً آپ کہیں گے نہیں۔ آخر پھر کس لئے
بنایا ہے؟ آپ کا ہی جواب ہو گا کہ اس سے گھر کی تاریکی دور ہو جائے
اندھیرے میں اجالا پیدا کیا جائے۔ لہذا اب اسے مارجس کے پاس
لانا ہو گا۔ اسے روشن چراغ کے قریب لایا جائے گا۔

بسے اسی طرح مرشد برحق، مرید کے دل میں عشق و محبت کا دھواگال
تولگا دیتا ہے مگر جب وہ یہ چاہتا ہے کہ اس میں روشنی پیدا کی جائے
تو مرکز نور ہیں فدائے محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، تو وہ
اس دل کو سرکار کی بارگاہ میں پیش کر کے عرض کرتا ہے یا رسول اللہ!
دھواگال لگا دینا میرا کام تھا، روشنی بخشنا آپ کی شان ہے۔ پھر آفتاب
دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم اسے روشن فرماتے ہیں۔

حضرات! اگر موم بتی جلا کر آپ چار دیواری پر رکھ دیں یا

کھلی ہوئی فصیل و چھت پر یا آنگن میں رکھ دیں۔ آندھی و طوفان تو درکنار ہوا کا ایک معمولی جھونکا برداشت نہ کر سکے گی۔

لہذا معلوم ہوا، اگر اس روشنی کی حفاظت چاہتے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ موم بتی روشن رہے، بجھنے نہ پائے تو اسے کسی فانوس میں رکھتے ہیں۔ شیشے کی چہار دیواری سے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ تاکہ ہوا شیشے سے ٹکرائے گزر جائے اور موم بتی کی تو محفوظ رہ جائے۔

حضرات! بس ایسے ہی سرکارِ دو عالم نے اسے روشن تو فرمادیا مگر جب آقائے دو جہاں کرم فرمایا چلتے ہیں کہ دل کی روشنی بجھنے نہ پائے یوں ہی برقرار رہے۔ تو پھر وہی دل فانوسِ الہی میں پیش کر دیا جاتا ہے، تاکہ حوادثِ روزگار اور خواہشاتِ نفسانی کے تند و تیز جھونکے اسے بجھا نہ سکیں۔

حضرات! اس منزلِ ارتقا کو اس طرح درجہ بدرجہ طے کیا جاتا ہے وہ نادان ہیں جو یہ کہتے ہیں ”پیری مریدی“ کی کیا ضرورت ہے؟“ واضح رہے، یہ دولتِ گرانما بہ محض سجدوں کے سہارے نہیں ملتی تاوتلیکہ کسی مرشدِ برحق کی ہدایات و عنایات اور توفیقِ الہی، اس کے شریکِ حال نہ ہو جائے۔

سرد غمِ عشق بوالہوس را ندہند

سوزِ دل پروانہ مگس را ندہند

عمرے باید کہ یار آید بکنار

ایں دولتِ سرمد ہمہ کس را ندہند

اے آپ اس طرح سمجھئے کہ ہمارا اور آپ کا یہ بڑا خاکی دو

جیزوں سے مرکب ہے ایک بدن، دوم روح، بہت سے لوگ یہ

چاہتے ہیں کہ بدن میں توانائی آجائے، بازوؤں میں پھلیاں نکل آئیں،

ہنڈلیاں خوب کسی کسی ہو جائیں تو ایسا شخص گاماپہلوان کا اکھاڑا ڈھونڈتا ہے۔ اور کچھ ایسے لوگ ہیں جو روح کی غذا اور چارہ کے متلاشی ہوتے ہیں کہ روح میں مازگی اور بالیدگی آجائے تو وہ پھسلوان کا اکھاڑہ نہیں بلکہ خواجہ کا آستانہ ڈھونڈا کرتے ہیں۔

معلوم ہوا جسم اکھاڑہ میں سنوارا جاتا ہے اور روح اشراف کی چوکھٹ پر سنواری جاتی ہے۔ وصول الی اللہ کے لئے اشراف کی چوکھٹ ہی سب سے بڑا وسیلہ بنتی ہے۔

مور بے کس ہوئے داشت کہ در کعبہ سد

دست بر پائے کو ترزو و ناگاہ رسید

حضرات! آپ گھبراہٹ میں نہیں ہیں ابھی آپ کو باور کرانا چاہتا ہوں کہ تصوف و طریقت کی جان، دل کی اصلاح اور اس کی طہارت و پاکیزگی ہے۔ یہ درست تو سب درست، یہ بگڑا تو سب بگڑا۔

حضرات! ایک واقعہ یاد آیا اسے سماعت فرمائیے:

اللہ کے ایک ولی (غالباً حضرت امام کرخی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ ہے) ان کی بزرگی اور زہد و تقویٰ کا بہت شہرہ تھا۔ ایک کبل پوش درویش ان کی خدمت میں چلے۔ دروازہ پر دیکھا کہ ایک دونہیں بہت سے قیمتی گھوڑے دروازے پر بندھے ہیں جن کے گلے میں ریشم کی ڈوریاں ہیں اور سونے کے کھونٹے ہیں بندھے ہوئے ہیں۔ یہ دیکھتے ہی درویش کے دل میں خیال آیا یہ کیسی ولایت ہے جسے دیکھ کر بادشاہ بھی شرمایا جائے۔ اسے دنیا دار کہا جائے یا اللہ والا بہر حال اس خطرے نے دل میں جگہ بنایا۔ کچھ دیر کے بعد ہمانوں کے لئے دسترخوان بچھا۔ یہ درویش بھی شریک ہوئے۔ اسی انار میں درویش نے اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ مٹوں سے دل کی

آرزو تھی اللہ کا گھر دیکھنے کی۔ کاش خانہ کعبہ کی زیارت نصیب ہوتی۔ امام
کرخی رحمۃ اللہ علیہ خاموشی سے اسے سنتے رہے جب بہانہ کھانے سے
فارغ ہوئے تو امام کرخی نے درویش کا ہاتھ تھاما اور ہاتھ بکڑ کر ٹپکنے لگے
چند فرلانگ بڑھے حتیٰ کہ بڑھتے بڑھتے کئی میل دور نکل گئے۔ اب
درویش سے نہ رہا گیا تو اس نے کہا حضرت کہاں تک چلے گا؟
آپ نے فرمایا ابھی تم یہ کہہ رہے تھے بیت اللہ کی زیارت کا
شوق مدتوں سے دامن گیر ہے۔ لہذا میں تمہیں تھلا نہیں رہا ہوں۔ بلکہ
زیارت حرمین کے لئے چل رہا ہوں۔

یہ سن کر درویش بولا، چلے تو ضرور مگر اپنا کبل اور لوہے کا چھڑ
تو آپ ہنکے یہاں چھوڑ آئے ہیں۔ اس پر حضرت امام کرخی نے فرمایا بہت
ہی افسوسناک اور جبرت کی بات ہے کہ وہ کبل اور لوہے کا چھڑ دل
میں بیٹھا ہوا ہے جو نہیں اللہ کے گھر جانے سے روک رہا ہے۔

اسے درویش! میرے دروازہ پر تو نے گھوڑوں کو دیکھا
ریشم کی ڈوریاں اور سونے کے کھونٹے دیکھے تو تیرے دل میں یہ خیال آیا
کہ یہ دنیا دار ہے مگر ہمارا، تمہارا فرق یہ ہے کہ تمہارا کبل اور چھڑ تمہارے
دل میں بیٹھا ہوا ہے اور دروازہ پر سونے کے کھونٹے زمین میں گرے
ہیں۔ میرے دل میں نہیں گرے ہیں۔ یہ یاد الہی سے بسا ہوا ہے۔

آپ کو نصیحت کرنی تھی کہ درویشی اس کا نام نہیں کہ بدن کو کبل
اور چھڑ سے سجایا جائے۔ بلکہ فقیری اور درویشی اس کا نام ہے کہ اس دل
کو یاد الہی سے بسایا جائے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست

تازہ بخشد، خدا کے بخشندہ!

اسی لئے اس راہ کے منزل رسیدہ اور دریائے معرفت کے

تیراک دشناور حضرت سرکار اسی فرماتے ہیں: ہ
 ملنے کی یہی راہ، نہ ملنے کی یہی راہ،
 دنیا جسے کہتے ہیں عجب اہ گزر رہے

حضرات! ابھی میں اسی حقیقت کو واضح کر رہا ہوں طریقت
 کی کائنات اس دل کی صفائی ہے اس کے بغیر یاد الہی کی لذت و چاشنی
 نہیں مل سکتی۔ میں نے شروع میں آپ سے عرض کیا تھا کہ یہ منصب
 اعلان کا نہیں۔ بلکہ چھپانے کا ہے۔

چنانچہ اس سلسلہ میں سیدی سرکار حضرت مخدوم سمنانی رحمۃ اللہ
 علیہ نے حضرت احمد جام حشمتی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ ”لطائف“
 میں قلم بند فرمایا ہے۔ یہ خدا رسیدہ اور ہائے کے بزرگ، مزدوری
 ان کا پیشہ اور بظاہر وہی ذریعہ معاش تھا۔ جب آپ کے وصال کا وقت
 قریب آیا تو آپ نے اپنے ساتھیوں کو بلا کر وصیت فرمائی کہ اب مجھے
 ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ قبر مجھ سے قریب اور میں قبر سے میری رحلت
 کا زمانہ قریب آچکا ہے۔ لہذا تم لوگ ایسا کرنا، جب میرا وصال ہو جائے
 تو دیکھو یہ چولہا ہے اور اس پر توا ہے میں نے ہمیشہ ایسا پر روٹی پکا
 کر کھائی ہے۔ لیکن میں نے اس کی کالکھ کو کبھی صاف نہیں کی تھی ہی کے
 لئے چھوڑ رکھی تھی۔ ایسا کرنا اس کی کالکھ میرے منہ میں تل دینا۔ کیوں کہ
 میں اس قابل نہیں کہ اپنے رب کو یہ گنہگار چہرہ دکھا سکوں اور یہ لوہے
 کی زنجیر ہے تم لوگ اسی سے میری کربانہ کر کے مٹا دینا۔ قبرستان
 لے جانا۔ میں اس قابل کہاں کہ مسلمانوں کے کاندھے پر میرا جنازہ جاہے
 کہہ دنوں بعد حضرت احمد جام حشمتی رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہو گیا
 اور وہ اپنے محبوب حقیقی سے جا ملے۔ وصال کے بعد لوگوں کو حضرت
 کی وصیت یاد آئی۔ جناب سیدی سرکار حضرت مخدوم سمنانی علیہ الرحمۃ

والرضوان تخریر فرماتے ہیں کہ ان نادانوں اور حقیقت حال سے نا آشنا
نے وصیت پوری کرنی چاہی بس اتنے میں بہت زور کی ایک کالی آنکھ
آئی کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ سوچے اور ہاتھ غیبی نے آواز دی خبردار کسی
کا ہاتھ میرے محبوب بندہ کی طرف نہ بڑھے ورنہ پوری کائنات سیاہ
کر دی جائے گی۔

لوگوں کا کلیجہ کانپا۔ اب انہیں ہوش آیا کہ جسے ہم اپنا ہی جیسا
سمجھتے تھے وہ اتنا خدا رسیدہ تھا۔

حضرات: طریقت ایک ایسی پیچیدہ راہ ہے کہ اس کی ریت
درم ہی الگ اور جد آگاہ ہے۔

خیال تو فرمائیے اس قدر اپنے کو چھپا کے رکھا کہ قریب سے
قریب تو لوگ بھی احمد جام حشری کو نہ پہچان سکے۔

آج کچھ بھی نہ ہو کر کرامات کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے اور یہاں
سب کچھ ہو کر گدڑی میں لعل کے مانند دنیا سے چل بسے۔

یہی میں نے عرض کیا تھا کہ یہ منصب ولایت اعلان کا نہیں،
چھپانے کا ہے۔ اور یہ لباس کی رنگارنگی کا نام نہیں بلکہ دل کو علانی دنیا
سے پاک و صاف کرنے کا ہے۔

چنانچہ آپ کو اس واقعہ سے بھی بصیرت حاصل ہوگی۔ حضرت
مولانا مودود رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جن کی جلالت علم کی ایک دنیا معترف
ہے، جب ان پر علم ظاہر کا غرہ تھا تو اپنے اہم معاصرین کے ساتھ بیٹھے
ہوئے کچھ علی مذاکرات اور پنکات پر گفتگو فرما رہے تھے۔ اسی اثنا
میں ایک صاحب دل درویش قریب آکر بیٹھ گئے۔ اور خاموشی سے
ان لوگوں کی باتیں سننے لگے۔ آخر جب نہ رہا گیا تو فرمایا: ”اب چیت“
یہ کیا ہے۔ یعنی تم لوگ جو آپس میں گفتگو کر رہے ہو یہ ہے کیا؟

مولانا روم اس بے جاد دخل اندازی کو برداشت نہ کر سکا اور چھٹلا کر بولے
 "یہ ہمارا قال ہے جس کو تو نہیں جانتا" قال، قول سے ہے جس کے معنی گفتگو
 اور بات چیت کے ہیں۔

بس درویش نے یہ سننے ہی مولانا روم کی کتاب پانی بھرے حوض
 میں پھینک دی۔ مولانا روم پر تو غصہ پہلے ہی سے طاری تھا مگر یہ آگ پر
 پٹرول کا کام کر گیا۔ غصہ میں تمنا اٹھے اور فرمایا، تم نے یہ کیا کیا؟
 درویش نے کہا، اگر میں پھینک سکتا ہوں تو کیا تم نکال نہیں
 سکتے؟ جادو نکال لو۔ یہ سن کر آگ بجولہ ہو گئی، یا اللہ کس باگل سے سابقہ
 پڑ گیا۔ لیکن ایک اہل علم ہی کتابوں کی قیمت اور وزن سمجھتا ہے۔ ایک
 مجاہد تلوار کے سہارے لڑتا ہے، اور عالم اپنی کتابوں کے بل بوتے میں ملن
 مناظرہ سر کرتا ہے۔

بہر حال، آگے بڑھے اور حوض میں ہاتھ ڈالا، انگلیاں، پتھیلی اور
 کلائی یہ سب حوض کے پانی سے تر ہو گئیں۔ کتاب باہر نکلا لیکن کتاب
 پٹا تو کسی ورق، کسی سطر، کسی نقطہ پر پانی کا کوئی اثر ہی نہیں تھا۔ گویا
 زمین پر رکھی تھی۔ اسے اٹھا لیا۔

اب مولانا روم کی حیرانی کی انتہا نہ رہی۔ اور اسی کیفیت میں سوال
 کر بیٹھے۔ آئے درویش! میں چہیت؟ "اے درویش یہ کیا ہے۔ درویش
 نے کہا وہ تمہارا قال تھا جس کو میں نہیں جانتا تھا۔ یہ ہمارا حال ہے جس کو
 تم نہیں جانتے۔

بس اب مولانا کے دل کا دروازہ کھل گیا۔ درویش نے سبقاً سبقاً
 نہیں پڑھا یا، آنکھوں آنکھوں میں پلا دیا۔ چنانچہ اب علم ظاہر کا غلبہ جاتا رہا
 اور دل کا دروازہ کھلتے ہی معرفت الہی کا زینہ مل گیا۔ پھر وہ مولانا روم جو
 ایک کتاب کے ضائع ہونے پر درویش پر گرجے برے تھے اب وہی

فرماتے ہیں :-

صد کتاب صد ورق در نار کن

آتش منسرد را گلزار کن

اب کتاب ہی نہیں بلکہ فرماتے ہیں پورا کتب خانہ نذر آتش
کر دو۔ خدا کو کاغذ کی کتابوں سے نہیں ڈھونڈا جاتا بلکہ اسے دل کی
کتاب میں تلاش کیا جاتا ہے۔ جاننے ہو وہ درویش کون تھے حضرت
شمس تبریز۔ جن کے متعلق مولانا روم کو کہنا پڑا ہے
مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم
تا غلام شمس تبریز نہ شد
ایسے ہی حضرت نیاز بریلوی پر جب باطن کا غلبہ ہوا تو فرماتے

ہیں :-

مکتب عشق میں گئے، درس مقام فنا لیا !!

جو لکھا پڑھا تھا نیاز نے اسے ضا دل سے بھلا دیا

حضرات! طریقت کی دنیا ہی سب سے الگ تھلگ ہے۔ ان کی
مصطلحات جدا گانہ ہیں اور تلاش محبوب کے لئے راہوں کے یقین میں ان دشوار
گزار گھاٹیوں سے گزرنا پڑتا ہے جو انتہائی کٹھن، حوصلہ شکن اور صبر آزما
ہیں۔ بس توفیق الہی جس کا ساتھ دیدے وہی منزل سے ہمدوش و ہم کنار
ہوتا ہے۔ جہاں اس نے اسے اپنا کیا دھر اسبھا اور اپنی کمائی بھی، اور
توفیق الہی سے رشتہ ٹوٹا بس اس کا بیڑہ غرق ہوا ہے

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں

فیضانِ محبت عام سہی عرفانِ محبت عام نہیں

حضرات! ابھی میں نے آپ سے عرض کیا کہ تصوف کی اصطلاحات
اور تلاش منزل کی رسم و ریت سب سے الگ تھلگ ہیں۔ اب جی چاہتا ہے

کہ غور سے بہت اس کی بھی تشریح ہو جائے تاکہ مذکورہ باتوں کا کوئی گوشہ پرودہ تاریکی میں نہ رہ جائے۔

مثلاً شریعت کی اصطلاح میں شرک ایک ایسے پاپ کا نام ہے۔ خدا کے یہاں جس کی معافی نہیں۔ قرآن میں اس کی صراحت ہے۔ شریعت میں شرک کی ذات و صفات میں کسی کو شرک شہر اسے کا نام شرک ہے اس کی ذات میں کسی کو شرک بنانا شرک فی الذات ہے۔ اور اس کی ایسی صفت میں جو اشتبارک و تعاضل ہی کے لئے خاص ہے اس میں کسی بندے کو شرک بنانا شرک فی الصفات ہے۔ مگر بعض صوفیاء اور اہل اشراق کی نظر میں خدا کے وجود کے سوا اور کسی کا بھی وجود ماننا شرک ہے۔

حضرات! نہ تو اسے مبالغہ آمیزی کہا جاسکتا ہے اور نہ ہی فن کی بازیگری، بلکہ یہ وہ حقائق ہیں جس کا اعتراف سبھی کرتے ہیں لیکن ہر شخص کی نگاہ و اہل تکلف نہیں پہنچتی۔ یہ ان کی دور رس نگاہ ہے جس نے بطن در بطن کا سراغ لگایا۔

جس طرح پیاز کسی کو کھلی شئی کا نام نہیں ہے بلکہ ہر چھلکے کے بعد چھلکا گویا تہ بہ تہ چھلکا ہے۔ اسی طرح شریعت و طریقت کے بہت سے مسائل تہ بہ تہ ہوتے ہیں۔ وہ ایسے اسرار و رموز ہیں کہ حجاب اندر حجاب پرودہ پرودہ، انھیں کو بطن اندر بطن سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بطن کے معنی پیٹ۔ چونکہ جو پیٹ میں چیزیں ہوتی ہیں وہ چھپی ہوئی ہیں۔ اسی طرح شریعت و طریقت کے ایسے مسائل جو اسرار و مجید ہوتے ہیں پرودہ پرودہ ہوتے ہیں۔ انھیں بھی بطن و بطن سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اب جس کی جیسی نگاہ ہوگی ویسے ہی وہ پرودہ اٹھاتا چلا جائے گا۔

حضرات! میں نہ جانے کیسے ایک خاردار جھاڑی میں الجھ گیا موضوع سے کچھ لگتی ہوئی بات تھی اس لئے اسے چھو لیا۔ ورنہ یہ خود ایک

ایک مستقل عنوان ہے۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ بعض صوفیائے کرام فرماتے ہیں خدا کے سوا کسی اور کا وجود ملتا اس کی اصطلاح میں شرک ہے۔ یہ کوئی محض خانہ ساز اصطلاح نہیں ہے۔ بلکہ حقائق و معارف پر اس کی بنیاد ہے۔

اب آئیے اس بحث کو محض فکری و نظری نہ بنا کر مشاہدات کے ساگر میں کھنچا لیں۔ تاکہ مغز اور چمکے کا صحیح امتیاز ہو سکے۔

حضرات! بعض صوفیاء کا یہ فرمانا کہ خدا کے سوا کسی اور کا وجود ماننا شرک ہے، بظاہر یہ اچھے میں ڈال دینے والی بات ہے۔ اور ایک ایسا نظریہ ہے کہ مرتبہ اول میں ذہن اس کو قبول کرنے کو آمادہ و تیار نہیں، لیکن میں آپ کو پہلی بھانا نہیں چاہتا بلکہ منتشر یہ ہے کہ مسئلہ کی اصل تصویر بے نقاب ہو جائے تاکہ اس کے تمام خدو خال روشن ہو جائیں۔
حضرات! اب اس کو سمجھنا ہے تو ایک مثال سے یوں سمجھئے اب اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ہم اور آپ ساحل سمندر پر آجائیں۔ غالباً آپ سب لوگ ساحل پہنچ گئے ہوں گے۔
جی ہاں، جی ہاں۔

دیکھئے یہ سمندر ہے اس کی کبھی ہوئی رو پہلی چادر ہے، یہ پانی ہے وہ ہولے ہولے چلتی ہوئی لہریں ہیں، وہ سینہ تانے ہوئے اٹھتی ہوئی موجیں ہیں۔ وہ دیکھئے بھنور ہے، وہ طغیانی ہے، وہ حباب و بلبے ہیں شکلیں سب کی جدا گانہ اور نام سب کے الگ الگ۔ نہر موج، بھنور، طغیانی، حباب۔ مگر اب ایسا کیجئے کہ لہر دکھائیے پانی نہ ہو، موج دکھائیے پانی نہ ہو، طغیانی و بھنور دکھائیے پانی نہ ہو، حباب اور بلبے دکھائیے مگر پانی نہ ہو۔ بس اب راز پرستہ کھل گیا۔ آنکھوں کا حجاب ہٹ گیا۔ ذہنوں کے دریچے کھل گئے۔ فکر کو آگہی ملی، ذہن کو شعور ملا، چونکہ اب

مسئلہ فکری و نظری نہ رہ گیا، آنکھ دیکھ رہی ہے، فطرت گذر رہی ہے
اور وہ مسئلہ جواب تک ہزار ہا تاریکیوں میں تھا اب اسنے اجلے میں
آگیا ہے کہ آنکھ دیکھی جائے اور وجدان قبول کرتا جائے۔

موس ہو کہ لہر، موج، بھنور، طغیانی، جباب، شکلیں الگ
الگ مگر پانی کے بغیر ان کا کوئی وجود نہیں۔ ان کا جب بھی وجود ہوگا
پانی ہی سے لگا پٹا ہوگا۔ پانی سے ہٹ کر ان کا کوئی وجود نہیں بس اپنے
مسکب وجودی رکھنے والے صوفیاء کا کہنا ہے کہ یہ آسمان اور زمین، چاند
تارے ان میں سے کسی کا وجود حقیقی نہیں۔ جس طرح پانی کا وجود اصل ہے
اور باقی سب کا غیر اصلی یعنی وجود اصلی کے تابع۔

بس ایسے ہی کائنات کا وجود واد جو اصلی نہیں ہے۔ وجود اصلی
صرف وحدہ لا شریک کا ہے اور جلد موجودات کی ہر شئی اسی کے تابع
ہے۔ فاکتہ شعلی ذالک۔

حضرات! بظاہر بہت ہی کٹھن تھا مگر مشاہدات کی دنیا سے
اسے اب بالکل پانی پانی کر دیا۔

ظہر کار مشکل بود لیکن بر خود آسان کردہ ایم

ایک غلط فہمی کا ازالہ: حضرات! طریقت کسی بے راہ روی کا نام نہیں
ہے۔ بعض لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ شریعت کے فکری و علمی آزادی کا دوسرا
نام طریقت ہے۔ یہ سراسر نفس کا قریب اور دھوکا ہے۔ دنیا کے پست ہم
اہم اور شریف فن پر ایک اتہام و الزام ہے۔ ڈھونڈنے سے جس کی مثال
نہ مل سکے۔ اس کے سوا اور کیا کیا جائے۔ یہ

ہر لو اہوسس نے حسن پرستی شعبار کی

اب آبرو سے شہوہ اہل نظر سے دگئی

اب اس مقام پر مجھے کہہ لینے دیجئے کہ شریعت کی سب سے کٹھن یا بند
کا دوسرا نام طریقت ہے۔

ابھی حال ہی میں، میں کرناٹک کے دورہ پر گیا تھا۔ اپنے محترم
میرزا بن، عزت مآب الحاج بڈن صاحب کے یہاں سے ہو کر تنظیم عظمت
مصطفیٰ کی مشن میں شرکت کے لئے دارالعلوم شاہ جماعت اہل حق
والہ پہنچ کر یہ معلوم ہوا کہ اس علاقہ میں ایک ایسا فرقہ ہے جو دل کی نماز
بڑھاتا ہے یعنی انھیں نیت، تکبیر، ثناء، قرائت، رکوع، سجود، قیام، قعود
کسی کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار
جب ذرا گردن جھکائی، دیکھ لی

حضرات! اگر ایسے نامہاد اہل طریقت کو یونہی بے لگام چھوڑ دیا
گیا تو اس فن شریف پر جو تبحر آئے گی اس سے ان کا تو کیونہ بگڑے گا
جو نہ کہ یہ خود ہی بگڑے ہوئے ہیں البتہ اندیشہ ہے کہ ہمارے گوشہ نشین
صوفیاء جو اپنے اسلاف سے توکل و قناعت کی امانت لئے تھے اس سے
کہیں ان کی پاکیزہ اور مقدس زندگی پر کوئی حوت نہ آجائے۔ ہمارا بے خبا
حریف تو وہ ہے جسے ڈوبنے کو تینکا کا سہارا چاہئے۔ وہ اسی تانک اور
گھات میں رہتا ہے کہ خانقاہی زندگی کو بدنام کرنے کے لئے کہیں سے
بھی کوئی ایسا میسٹر بل بل جائے جسے ممکنہ بنا یا جائے کہ خواہ وہ فٹ
پاتھ کا ہی شرک چھاپ صوفی کیوں نہ ہو۔

اسی لئے علماء و صوفیاء دونوں کی مشترکہ ذمہ داری ہے کہ علماء
اپنی تقریر و تحریر سے اور صوفیاء اپنے کردار و عمل اور خانقاہی وضو
سے، حریفوں کی ہر سازش کو ناکام بنادیں۔

سَلَامٌ وَقِيَامٌ

الْحَمْدُ لِلَّهِ وَكَفَى وَسَلَامٌ عَلَى حَبِيبِهِ الَّذِي صَلَّطَ
 اَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
 اِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ
 آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝

جوشے تری نگاہ سے گزے درود پڑھ،
 ہر جزو کل ہے منظر کبر انوار مصطفیٰ
 (علیہ التحیۃ والثناء)

حضرات! ہماری تقریر کا عنوان ہے ”درود و سلام“ اسی سبب
 سے میں نے قرآن مجید کی اس آیت کی تلاوت کی ہے جس میں درود و سلام
 کا تذکرہ ہے۔

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے
 ہیں ”نبی“ پر۔ اے ایمان والو تم صلاۃ بھیجو اور سلام بھیجو مصطفیٰ پر۔
 حضرات! یہ مفہوم یوں بھی ادا کیا جاسکتا تھا کہ پہلے اللہ تعالیٰ
 ایمان والوں کو حکم دیتا کہ اے ایمان والو! صلاۃ و سلام بھیجو میرے مصطفیٰ
 پر۔ اللہ اور اس کے فرشتے بھی بھیجتے ہیں۔ درود و سلام۔

لیکن قرآن کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے خدا اپنے اور فرشتوں کے
 بھیجنے کا ذکر فرماتا ہے۔ اور بعد میں ایمان والوں کو حکم دیتا ہے۔
 حضرات! یہ واضح رہے کہ قرآن کی ترتیب بے معنی نہیں ہوتی
 اس کی ترتیب اپنے اندر بڑی معنویت چکھتی ہے۔

اس کو ایک مثال سے سمجھے اور قرآن سے ہی سمجھے۔
مثلاً قرآن کہتا ہے فَذَرِكُنَّ أَكْثَرَهُنَّ اللَّهُ يُؤْتِيكِ الْكِتَابَ جِبِينَ۔
تم لوگوں میں اشرکی طرف سے نہ آیا اور روشن کتاب۔ اسے یوں ہی
کہا جاسکتا تھا کہ تم لوگوں میں روشن کتاب آئی اور اشرکی طرف سے نور
آیا۔ لیکن قرآن نے پہلے نور کہا اور بعد میں کتاب۔

حضرات! نزول قرآن میں اس کی بہت رعایت ہے کہ اپنی تفہیم
میں مزاج انسانی سے بہت قریب ہو۔ ورنہ مقصد ہدایت کے مجروح
ہونے کا اندیشہ رہے گا۔

اس معاملے میں انسانی فطرت یہ ہے کہ جب وہ کسی کتاب کا مطالعہ
کرنا چاہتا ہے تو ہاتھ میں پہلے کتاب نہیں لیتا بلکہ روشنی کا اہتمام کرتا ہے
بس ایسے ہی قرآن نے پہلے نور کا ذکر کیا اور بعد میں کتاب کا۔ تاکہ آدمی
کتاب کی طرف آنے سے پہلے نور مصطفیٰ سے قریب آجائے۔ یہ روشنی
ہوگی تب تو قرآن سمجھے گا ورنہ نہیں۔

بہر حال یہ ایک ذیلی اشارہ ہے کہ ترتیب قرآن میں بڑی معنویت
ہے۔ اگر آپ اسے ایک مستقل تقریر بنا چاہیں تو چند آیات اسی طرح کی
منتخب کر لیں اور ترتیب قرآن کی معنویت اس کا عنوان بنالیں۔

حضرات! آج کے موضوع کے لئے میں نے آیت درود کی تلاوت
کی ہے۔ اس میں پانچ الفاظ ایسے ہیں جب تک آپ اسے نہ سمجھیں گے آیت
کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکتے۔

اللہ، ملیکہ، انسبی، صلوات، سکلام۔
اب آپ حضرات ذہن کی حاضری کے ساتھ بیٹھ جائیں تاکہ میں
بالترتیب ایک ایک کا مفہوم سمجھا سکوں۔
درس گاہ نظامی کا ہندی طالب علم بھی جانتا ہے جس کی نگاہ سے

شرح تہذیب گزری ہوگی کہ اللہ اس ذات واجب الوجود کو کہتے ہیں جو سب سے
 ہو جمع صفات کمالیہ کو۔ یعنی اللہ ایک ایسی ذات ہے جو ہمیشہ سے ہے آج
 ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اور اس کی جتنی بھی صفات ہیں وہ سب کمال والی
 ہیں۔ یعنی اس کی کوئی صفت ایسی نہیں جو رذیل اور گھٹیا درجے کی ہو چنانچہ
 اسلامی مکاتب میں بچوں کو جو کتاب پڑھائی جاتی ہے اس میں بھی بچوں کو یہی
 پڑھایا جاتا ہے کہ اللہ بے عیب ہے، ہر عیب سے پاک ہے۔

اب اگر ذہن نے اسے قبول کر لیا کہ اللہ ذات واجب الوجود کو
 کہتے ہیں اور اس کی جملہ صفات کمال والی ہیں، اس کی کوئی صفت رذیل،
 کمزور، گھٹیا اور نقص والی نہیں۔ بلکہ تمام صفات اعلیٰ درجے کی کمال
 والی ہیں۔

تو اب یہیں سے ایک عقیدہ باطل کا از خود بطلان اور رد ہو جاتا
 ہے۔ بعض نام نہاد کلمہ گو جن کا دعویٰ ہے کہ خدا کے لئے جھوٹ بولنا ممکن
 ہے، اب ان سے دریافت کیجئے کہ جھوٹ رذیل اور گھٹیا درجے کی صفت
 ہے یا اعلیٰ درجے کی؟

حتیٰ کہ جھوٹ عام نگاہوں میں بھی ایسا پاپ ہے کہ ایک ایسا جھوٹا
 جو جنم بھر کا جھوٹا ہو۔ گاؤں، محلہ، پڑوسی اور اپنے بیگلے سبھی اس کو
 جھوٹا کہیں حتیٰ کہ خود اسے بھی اپنے جھوٹے ہونے کا یقین ہے لیکن ایسے
 جھوٹے کو اگر آپ جھوٹا کہیں تو مرنے مارنے کو تیار ہو جائے۔

قربان جائے ایک پرلے درجے کا جھوٹا تو اپنے کو جھوٹا سننا پسند
 نہ کرے مگر توحید خالص کے اندھے پکاری اپنے خدا ہی کی طرف نامکان کرنا
 کی نسبت کر کے اسے جھوٹا کہلوا جاتا ہے۔

حیرت تو یہ ہے کہ انھیں جھوٹا کہو تو آگ بگولہ ہو جائیں اور ان کے
 خدا کو جھوٹا نہ کہو تو سداں مناظرہ میں کستی لڑنے کو تیار ہو جائیں۔ مگر

بریں عقل و دانش بیاید گریست

لیکن ہر خردمند و ذی ہوش اسے اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ جن کا خدا جھوٹا ہو سکتا ہے اس کے بندے مجھلا کتنے بڑے جھوٹے ہوں گے۔
حضرات! آپ میں سے بھی کچھ حضرات حیرت میں ہوں گے کہ شتان نظامی ہیں کس بھول بھلیاں کی سیر کر رہا ہے جس خدا کے بارے میں ہم اس طرح کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتے وہ کیسی گندی ذہنیت کے ہیں جو خدا کے لئے امکان کذب کے قائل ہیں؟ اور بعض ذہنوں کا یہ چبھتا ہوا کانٹا ہو گا کہ آخر وہ لوگ تو پڑھے لکھے ہیں، وہ ایسا کیوں کر کہہ سکتے ہیں؟ یا کہا تو کیوں کہا؟

حضرات! اب میں آپ کی بھرپور توجہ چاہتا ہوں۔ ہم تن گوش ہو جائیے تاکہ اس فرقے کی فطالت و گمراہی آپ پر روشن و آشکارا ہو جائے۔

پہلے آپ یہ سمجھ لیں کہ ایک فرقہ ہے ”فرقہ زاغیہ“ جس کے بعض حضرات نے پہلے یہ کہا کہ ”خدا کا جھوٹ بولنا ممکن ہے“ اس مسئلہ کو کہا جاتا ہے ”امکان کذب باری“ پھر اسی فرقہ کے دوسرے حضرات نے کہا ”مکن ہی نہیں ہے بلکہ واقع ہو چکا“ اسے کہا جاتا ہے ”وقوع کذب باری“ یعنی ایک مسئلہ ہے امکان کذب باری اور دوسرا ہے وقوع کذب باری۔ اب آپ بالترتیب اسے سماعت فرمانے کی کوشش فرمائیں۔

اب ان کا یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ کا جھوٹ بولنا ممکن ہے اس سلسلہ میں ان کی دلیل یہ ہے کہ کل مقدوس العبد مقدوس اللہ یعنی جس پر بندہ قادر ہو اس پر اللہ بھی قادر ہے۔ اگر ایسا نہ مانا جائے تو بندے کی قدرت خدا سے بڑھ جائے گی یعنی بندہ تو قدرت رکھتا ہے مگر خدا نہیں۔

اپنے گلے میں پھانسی لگا کے مر جائے؟ یقیناً آپ کا جواب نفی میں ہوگا، کہ
 اللہ تبارک و تعالیٰ اس پر قادر نہیں کیوں؟ اس لئے کہ اللہ جسم سے پاک
 و صاف ہے۔ اس کے گلا ہی نہیں جسمیں پھانسی لگائے۔ البتہ اگر ہمارے
 حریف کا ایسا ہی خدا ہو تو اسے مبارک۔

ایسے ہی وہ "حی و قیوم" ہے ہمیشہ سے ہے، آج ہے اور ہمیشہ
 کے لئے ہے۔ اس کی موت ہی نہیں وہ تو خالق موت ہے۔ اسی طرح بندہ
 نہ جانے کن کن باتوں پر قادر ہے۔ اچھلنا، کودنا، دوڑنا، دھوپنا، سوتا
 اونگھنا، کھانا پینا وغیرہ وغیرہ۔ بندہ ان تمام امور پر قادر ہے تو کیا
 خدا خواستہ خدا بھی دوڑنے، دھوپنے، اونگھنے، سونے پر قادر ہے؟
 نعوذ باللہ من ذالک۔

اس کی تفصیل دیکھنا ہو تو سیدنا امام احمد رضا فاضل بریلوی رضی
 اللہ عنہ کی فتاویٰ رضویہ ملاحظہ فرمائیں

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا نے اس عقیدے کی بنیاد پر ان پر
 اعتراضات و لزومات قائم کئے کہ اگر تم خدا کا جھوٹ بولنا ممکن کہو گے، تو
 ایک جھوٹ ہی پر کیا موقوف، پھر تم جن جن باتوں پر قادر ہو خدا بھی ان
 سبھوں پر قادر ہوگا اور اسے مثال دے کر یوں سمجھایا کہ پھر اس سے لازم
 آتا ہے کہ تمہارا خدا، دوڑے، دھوپے، اچھلے، کودے، اونگھے، سوتے
 وغیرہ وغیرہ۔

مگر یہ بہرہ پئے اور اسٹیج کے کلاکار عوام کو دھوکا دیتے ہیں
 کہ سنیوں کا خدا وہ ہے جو اچھلے، کودے، اور ڈھٹائی کا یہ عالم کہ
 فتاویٰ رضویہ کو حوالہ میں پیش کرتے ہیں۔

لہذا عوام اسے بہت اچھی طرح محفوظ رکھیں کہ ان کا دجل و
 فریب ہے اور کھلی ہوئی عیاری و مسکاری ہے۔ یہ تو فریق نہ ہو سکی کہ

اپنے گھنٹے و گندہ عقیدے سے تو بہ کر لیتے، اپنے ہی عقیدے کو اپنی طرف
 نہ منسوب کر کے امام احمد رضا کی طرف منسوب کر کے انھیں بدنام کرنے کی سعی
 ناکام نے واضح کر دیا کہ یہ ایسا نشیب ہے جہاں پانی مر رہا ہے۔ اس
 عقیدے کی خرابی و گمراہی ان پر واضح ہے جیسا کہ تو اپنی طرف منسوب نہ کر کے
 امام احمد رضا کو بدنام کیا جا رہا ہے۔ اور اگر اس عقیدے کی طرف سے لوں
 میں چور اور کھوٹ نہ ہوتا تو ڈنکے کی چوٹ پر کہتے ہاں ہاں ہمارا ہی عقیدہ
 ہے۔ عوام کو گمراہ کرنے کے لئے لکھ تو دیا لیکن دارالافتاء نے منہ پر جو
 کالک لگا دی، وہ چھڑا ئے چھٹ نہیں رہی ہے بعض لوگوں نے تو کھرچنا
 چاہا۔ صورتیں مسخ ہو کر رہ گئیں مگر کالک نہ گئی۔

حضرات! میں نہ جانے کن کن کائناتوں میں الجھ گیا۔ عرض یہ کر رہا تھا کہ
 اللہ ہر شے پر قادر ہے، مگر مستغاثات و محالات تحت قدرت باری نہیں
 ہیں۔ ممکن ہے آپ ذہنی خلیان میں مبتلا ہوں کہ بات تو ان کی بھی قرین قیاس
 اور ذہن سے لگی پس معلوم ہوتی ہے کہ خدا کو ہر شے پر قادر ہونا چاہئے۔
 اب بہت ہی نازک سے نازک تر بات ہے جسے عرض کرنے جا رہا ہوں۔
 گذارش ہے کہ غفلت میں نہ رہئے بلکہ فلک پیمائیں کا دروازہ کھول
 دیجئے۔

حضرات! خدا کا جھوٹ بولنے پر قادر نہ ہونا اس کا نقص نہیں
 ہے بلکہ غایت درجے کا کمال ہے۔ ہمارا اور اس کا فرق یہ ہے کہ خدا جھوٹ
 پیدا کرنے پر قادر ہے اور ہم جھوٹ بولنے پر قادر ہیں۔ اللہ کی قدرت
 کو "قدرت علی الخلق" کہا جاتا ہے۔ اور بندے کی قدرت کو "قدرت
 علی الفعل" قدرت علی الکسب، یعنی وہ سب توجہ و قدوس جھوٹ پیدا کرنے
 پر قادر اور ہم جیسے معصیت کش، عصیاں شعار بندے جھوٹ بولنے پر
 قادر معلوم ہوا پیدا کرنے کی قدرت بولنے کی قدرت سے کہیں زیادہ بھاری

بھرم اور با وزن و بالا تر ہے۔ لہذا آپ اس سے یہ ہرگز نہ سمجھے کہ خدا کی قدرت معاذ اللہ گھٹ گئی۔ بلکہ بہت ہی بلند و بالا ہو گئی۔ جہاں گمراہوں کی نگاہ نہیں جاتی۔ حق شناسوں کی نگاہ وہاں بھی کام کرتی ہے۔ جبریت ہے کہ اپنی آنکھ کا شہتیر نہ دیکھنے والے دوسروں کی آنکھ کا تنکا تلاش کرتے ہیں۔ خالصہ
بِسْمِ اللّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ

تصویر کا دوسرا رخ

میں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ کسی نے کذب باری کا اقرار کیا۔ تو بعض لوگوں نے کہا، امکان نہیں بلکہ جھوٹ واقع ہو چکا ہے۔ اسے وقوع کذب باری کہا جاتا ہے۔

ان کا کہنا یہ ہے کہ خدا نے بندوں سے تو یہ فرمایا کہ یہ کرو گے تو یہ سزا، یہ خطا۔ تو وہ سزا، ایسا گناہ۔ تو ایسی سزا، لیکن کتنے ہیں جن کو معاف کر دیا۔ آخر یہ جھوٹ نہیں تو اور کیا ہے؟ لہذا خدا کا جھوٹ بولنا ممکن ہی نہیں بلکہ واقع ہو چکا ہے۔

حضرات! اس گمراہی، کج فکری، اور کج روی میں مبتلا ہونے کی جڑ اور بنیاد یہ ہے کہ اس طبقے نے وعدہ اور وعید کا فرق نہیں سمجھا۔ وعدہ یہ ہے، مثلاً آپ مجھے سے یہ فرمائیں کہ اگر تم اس بار امتحان میں فرسٹ ڈویژن سے کامیاب ہو گے تو پارک قلم دوں گا۔ بچہ کامیاب ہو گیا۔ لہذا اخلاقی سطح پر ضروری ہے کہ وعدہ پورا کیا جائے۔ بچہ کو قلم دے کر وعدہ پورا کیا جاتا ہے۔ چونکہ سماج، اخلاق، معاشرہ بلکہ خود اپنے ضمیر کا تقاضا ہے کہ وعدہ پورا کیا جائے۔ یہ وعدہ۔

اور وعید کے معنی ہیں ڈرانے دھمکانے کے۔ اس میں سزا بھی دی جاسکتی ہے اور معاف بھی کیا جاسکتا ہے۔

مثلاً اہلسنت کی بلند پایہ مرکزی درسگاہ دارالعلوم غریب نواز الہ آباد کا اصول ہے کہ گیارہ بجے رات تک طلبہ مطالعہ کریں۔ پھر ٹھیک گیارہ بجے دارالعلوم کا صدر دروازہ مقفل کر دیا جائے۔

فرض کر لیجئے کہ پرنسپل کی نگرانی میں چیراکی دروازے میں تالابند کر رہا ہے۔ اور ایک طالب علم دارالعلوم سے باہر تھا۔ ہانپتا کانپتا حاضر ہوا اور کہا حضور آج کسی وجہ سے پانچ منٹ دیر ہو گئی۔ معاف کر دیجئے اب آئندہ ایسا نہ ہو گا۔ پرنسپل نے چیراکی کو حکم دیا، گیٹ کھول دو۔ طالب علم اندر ہو گیا اور پرنسپل صاحب نے اسے کہا کہ آج تو میں نے چھوڑ دیا لیکن اب اگر آئندہ تاخیر ہوئی تو اتنی مار پڑے گی کہ سر سے بھیجا نکل آئے گا۔ اور ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جائے گی اسی کا نام اتفاق ہے کہ دوسرے روز دی طالب علم پھر دارالعلوم سے باہر رہا۔ اور آج دس منٹ کی تاخیر سے چیراکی تالانگار رہا ہے۔

دی طالب علم پھر دوڑتا دھو پتا اسے سرکار بھول ہو گئی، ایک بہت سی ضروری کام سے چلا گیا تھا تاخیر ہو گئی، آپ ہی ہمارے ماں باپ ہیں۔ ماں کو آپ کے سہارے چھوڑا، باپ کا پیار آپ نے بخشا۔ آپ نہ معاف کریں گے تو کون معاف کرے گا؟

پرنسپل صاحب کو ترس آیا ایسے میں پتھر نہیں، دل ہی تو ہے چیراکی سے فرمایا، تالاکھول دو۔ بچہ اندر داخل ہو گیا۔ پرنسپل نے فرمایا خبردار اب آئندہ ایسی غلطی نہ ہو۔

لیکن یہ سہارنپوری طالب علم کہنے لگا حضرت ہم تو سمجھتے تھے کہ آپ بہت سچے ہیں مگر معلوم ہوا کہ آپ بھی جھوٹ بولا کرتے ہیں۔ کل ہی آپ نے فرمایا تھا کہ آئندہ اگر ایسی غلطی ہو گئی تو سرسلاست رہے گا نہ کمر۔۔۔ لات گھونسنے تو درکنار بھول کی چھڑی سے بھی نہ مارا۔ دنیا اس کی عقل پر ہنسے گی۔

اور اس کا مذاق اڑائے گی۔

ارے نادان! اسے جھوٹ نہیں کہا جاتا اسے عفو و کرم، عنایت و ہربانی اور شفقت و مروت کہا جاتا ہے۔

معلوم ہوا وعدہ اور وعید کا ہی فرق ہے کہ وعدہ پورا کیا جاتا ہے اور وعید میں چلے پورا کیا جائے یا معاف کر دیا جائے مگر ان کی الٹی کھوپڑی کا یہ کہنا ہے کہ خدا، بندوں کو جو معاف کرتا ہے اس کا جھوٹ ہے۔ گویا یہ کہہ کر انھوں نے خود ہی اپنے اوپر "عفو و کرم" کا دروازہ بند کر لیا تو بھلا اب وہ ایسا کیوں کرنے لگا کہ انھیں معاف بھی کیا جائے۔ اور یہی اس کو جھوٹا بھی کہیں۔ اچھا ہے خوب پٹائی ہو اور ہوگی بھی۔ انشاء اللہ

ایک نکتہ

ہمارا کہنا یہ ہے کہ میدانِ عشر میں اگر خدا بندے کو اس کے مجرم کی سزا دیدے تو اس کا جلالِ تمہاری و جہاری تو نظر آئے گا پھر آخر اس کی شانِ کریمی و رحیمی کہاں ملے گی۔ وہ اگر تمہارے جت رہے۔ تو رحمن و رحیم بھی تو ہے ایسے ہی اگر ہر مجرم کو سزائیں دی جائیں تو بسے شفیقِ عشر کی شانِ شفاعت کہاں نظر آئے گی۔ ہم جیسے سب کا رتو اس لنگے بیٹھے ہیں، کہ گناہ اگر انھوں میں ہتھکڑی ڈلوانا چاہے گا تو ان کی "کالی کلی" اپنی پناہ میں لے لیگی۔ تبھی تو ہم کہہ سکیں گے کہ

کیا ہی ذوق افزا شفاعت ہے تمہاری واہ واہ

قرض یعنی ہے گنہ پر سبیزگاری، واہ واہ

حضرات! شاید کہ اس بحث میں ہم نے آپ کا کافی وقت لے

لیا۔ اب بہت ہی اختصار سے کام لیتے ہوئے ہیں گفتگو کرنی ہے۔ میں

نے آپ سے عرض کیا تھا کہ آیت درود میں پانچ الفاظ ایسے ہیں کہ جب

تک اسے اچھی طرح نہ سمجھ لیں گے اس وقت تک آیت کا صحیح مفہوم آپ پر واضح نہ ہو سکے گا۔

ابھی میں نے صرف "اشر" کی تعریف بتائی ہے اور مجھے ایسا کہ اس خالص علی گفتگو کو آپ جیسے دانشوروں نے بخوبی سمجھ لیا ہوگا جیسے آپ رکوع میں سبحن ربی العظیم کہیں اور سجدے میں سبحن ربی الاعلیٰ اب ہرگز ہرگز ایسے سبوح قدوس کے لئے نہ تو امکان کذب کے قائل ہوں گے اور نہ ہی وقوع کذب باری کے۔

فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ

(۲)

اب اس کے بعد آیت درود میں "ملائک" ہے۔ بیشک اشر اور اس کے فرشتے صلوٰۃ پھیلتے ہیں، لہذا اب آپ کو سمجھنا ہے کہ "ملائک" کسے کہتے ہیں۔ ملائک کی تعریف ہے کہ جسم فوری یا تشکل یا شکل مختلف فرشتہ اس جسم فوری کو کہتے ہیں جو اپنے آپ کو مختلف شکلوں میں بدل سکے۔

حضرت جبریل امین نوسید الملائکہ ہیں پھر ان کا کیا کہنا جنکی ڈیوی خدا کا پیغام بارگاہ مصطفیٰ تک پہنچانا ہے۔ اب میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آیت درود میں لفظ ملائکہ سے ہیں کیا سن ملتا ہے؟ حضرات! یہ آپ نے سمجھ لیا کہ فرشتہ جسم فوری کو کہتے ہیں۔ اس مقام پر اب آپ ایک حدیث کا مفہوم سماعت فرمائیں جسے "حدیث جبریل" کہتے ہیں۔

ایک بار آقائے کائنات کی بارگاہ میں آئے والا آیا اور رسول خدا علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دامن سے دامن ملا کر بیٹھ گیا۔ اور سوالات شروع کر دیئے۔ یا رسول اشر۔

ما الایمان یا رسول اللہ ایمان کیا ہے ؟
 ما الاسلام یا رسول اللہ اسلام کیا ہے ؟
 ما الاحسان یا رسول اللہ احسان کیا ہے ؟

صحابہ کرام حاضر دربار ہیں وہ دیکھ بھی رہے ہیں اور سن بھی رہے ہیں۔ صحابہ کرام حیران تھے کہ یہ آنے والا پہچان میں بھی نہیں آ رہا ہے اور مسافر و پردیسی بھی نہیں ہے۔ چونکہ چہرے اور لباس پر آثار سفر نہیں معلوم ہوتے تھے۔ جب سائل جاننے لگا تو آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسے صحابہ! کیا تم نے پہچانا یہ کون تھے؟ پھر سرکار نے فرمایا یہ جبریل تھے۔

میں آپ سے ایک بات دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ جبریل فریش خاک پر ہیں، زمین ہی پر بیٹھے ہیں، شکل بشر اور لباس بشر میں ہیں۔ خیال فرمائیے پاؤں کا بوجھ بھی ہے، انگلیاں ہیں، اس میں ناخن ہیں، پسند ٹی ہے، گھٹنے ہیں، ران ہیں، ہشکم ہے، سینہ ہے، ہاتھ ہیں، ٹانگی انگلیاں ہیں، پتھلی ہے، کلائی ہے، بازو ہے، کندھا ہے، گردن ہے، ٹھڈی ہے، ہونٹ ہیں، دانت ہیں، زبان ہے، رخسار ہے، ناک کے اوپر آنکھ ہیں، کان ہے، کپٹی ہے، ابرو ہے، برنگاں ہے، پیشانی ہے، سر ہے، سر کے بال ہیں، گویا پاؤں کے ناخن سے لے کر سر کے بال تک وہ سب کچھ ہے جو ایک بشر کو ہے۔

اب آپ سب لوگ سنیں کہ جواب دیکھ کر ٹھیک اس وقت جب جبریل امین سید المرسلین کی بارگاہ میں حاضر دربار ہیں خاک پر، شکل بشر اور لباس بشر میں ہیں تو انہیں خاکی کہا جائے گا یا نوری؟ جواب نوری، نوری...

حضرات! مجھے کہہ لینے دیجئے کہ سید الملائکہ، خاک پر بیٹھ کر شکل

اور لباس بشر میں نوری کپے جاسکتے ہیں تو یہ مصطفیٰ کے خادم ہی تو ہیں۔ پھر جس کے خادم کا یہ حال ہو کہ لباس بشر کا، شکل بشر کی، مگر کھا جائے نوری تو پھر اس کے آقا کو لباس بشر میں ہوتے ہوئے نوری کہتے ہیں تو کیا تکلیف کیا تاقل؟ ظ۔ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔

لہذا آئے درود میں لفظ ملائکہ سے بھی اس کا یقین کر لیا کہ جس کے خدمت گزار کو لباس بشر اور شکل بشر میں ہوتے ہوئے نوری کہا جاسکتا ہے تو آقا کو بدرجہ اولیٰ کہا جاسکتا ہے۔

علاوہ ازیں یہ بھی سمجھ میں آگیا کہ جبریل خاک پر بیٹھے ہیں مگر ان کو خاکی نہیں کہا گیا نوری ہی کہا گیا۔ تو اس سے یہ فلسفہ بھی سمجھ میں آگیا۔ "خاک پر آنا" اور ہے۔ "خاکی ہونا" اور ہے۔ اسی لئے تو پھر درگاہ عالم نے اپنے محبوب کو معراج کی رات عطا فرمائی: تاکہ دنیا لے کر میرے کی پاکیزہ گلیوں میں میرے محبوب کو دیکھا ہے تو مقام سدرہ پنبہ دیکھے جہاں جبریل نے عرض کیا تھا یا رسول اللہ اگر بال کی ٹوک برابر آئے بڑھا تو جل کے خاک ہو جاؤں گا۔ اگر سرکار کو یہی احساس ہوتا کہ جبریل جب فرشتہ نوری ہو کہتے نہیں جاسکتے تو میں معاذ اللہ خاکی ہونے کیسے چلا جاؤں گا۔

مگر سرکار کہے نہیں، ڈرے نہیں، پیشانی پر شکن نہ آئی چہرے کی بشارت نہ ٹوٹی۔ بڑے ہی طمانیت قلب سے فرمایا کہ جبریل تم بھلے ہی نہ جاؤ مگر تم تو چلے۔ پھر اتنی بلندی پر گئے جہاں جبریل کا ذہن نہ گیا۔ وہاں سے مرے مصطفیٰ کا کھانا گزر گیا۔ اس کی تفصیل واقعہ معراج میں ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ یہ ایک ایسا کڑا ہے جسے عزراں بنا کر منتقل ایک تقریب کی جاسکتی ہے۔

آیت درود میں ملائکہ کی قید سے اس کا پتہ چل گیا کہ جس کا خدمت گزار
لباس بشری میں نوری ہو سکتا ہے تو آقا کیوں نہیں ہو سکتا؟

مسئلہ نہیں رہ گیا بلکہ مشاہدے میں آگیا۔ اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ
میں آگیا کہ اس میں کوئی استحالہ نہیں۔ خدا کی قدرت میں ہے کہ لباس بشر کا
پہننے اور حقیقت نور کی بنائے۔ تعویذہ الامان کی شریعت میں اگر
قدرت الہی کو استحالہ کے ساتھ مانا جاسکتا ہے۔

”اللہ کی قدرت سے بعید نہیں اگر وہ چاہے تو محمد صبیح
کو وڑوں محمد پیدا کر ڈالے؟“

حالانکہ یہ محالات سے ہے۔ جب خدا فرما چکا کہ خاتم النبیین ہیں
ان کے بعد اب نبی نہیں پیدا کروں گا۔ اس کے باوجود یہ کہنا کہ ”اللہ کی
قدرت سے بعید نہیں۔ اگر وہ چاہے تو محمد صبیح کو وڑوں محمد پیدا کر ڈالے؟“
اسے عقل کے اندھو! اللہ اپنے ارادے اور اپنی مشیت کے خلاف چاہے
کامیوں؟

لہذا جب اس طرح کے منشعات و محالات میں خدا کی قدرت
مافی جاسکتی ہے تو پھر اس طرح کے ممکنات میں اللہ کی قدرت کیوں نہیں
مافی جاسکتی؟ کہ وہ لباس بشر کا دے اور حقیقت نور کی۔
فالحمد لله علی ذالک۔

(۳)

سنی: یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیت درود میں علی
النبی فرمایا۔ علی الرسول کیوں نہ فرمایا۔

حضرات! ہم اب تک آپ کو صرف اللہ اور ملائکہ کی تعریف
سمجھا کے۔ اب آیت درود کا تیسرا نقطہ ہے سنی۔ ہمارے بہت
سے سادہ لوح حضرات اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ نبی اور رسول میں کوئی

فرق نہیں۔ دونوں ہم معنی ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ رسول اسے کہتے ہیں جو صاحب شریعت جدیدہ ہو جسے خدا نے نئی کتاب، نیا قانون، نئی شریعت دی ہو۔ اور نبی اسے کہتے ہیں کہ خدا انہیں احکامات کی تبلیغ کے لئے کسی کو منتخب فرمائے۔

لہذا رسول خاص ہے، نبی عام ہے۔ یعنی ہر رسول نبی ہے مگر ہر نبی رسول نہیں۔

اس تعریف سے آپ جیسے دانشوروں نے بخوبی اندازہ کر لیا ہو گا کہ مقام رسالت مقام نبوت سے بلند ہے۔ لہذا ”آیت درود“ میں خدا اور اس کے فرشتے ان کے مقام نبوت پر درود و صلوات بھیجتے ہیں تو پھر ان کے مقام رسالت کا کیا کہنا۔ جو کہ مقام نبوت کے بھی بلند و بالا ہے۔

جب نبی اور رسول کی بات آئی گئی ہے تو پھر ایک ضروری مسئلہ اور بھی سمجھ لیں۔

حضرات! ہر نبی و رسول پر ایمان لانا ضروری ہے خواہ اس کے تفصیلات میں معلوم ہوں یا نہ ہوں یعنی نام، گاؤں، شہر، زمانہ، خاندان قبیلہ اس طرح اور دیگر باتوں کا علم ہو یا نہ ہو کہ ان کا نام کیا تھا، کب آئے کہاں آئے، کس قبیلے میں آئے وغیرہ وغیرہ۔ مگر ان پر ایمان لانا ضروری ہے۔ یہ بات ہمارے عقیدے میں ہو گئی کہ خدا نے جتنے بھی نبی و رسولبعوث فرمائے۔ ان پر ہمارا ایمان ہے۔

اسی لئے آپ نے منا ہو گا کہ جب محتاط علماء، انبیاء و رسل کی تعداد کا ذکر کرتے ہیں تو اس میں کم و بیش کی قید کا اضافہ کر دیتے ہیں یعنی کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء و رسل آئے۔ اگر یہ قید نہ لگائی جائے، صرف یہی کہا جائے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء و رسل

آئے۔ تو اس میں یہ خرابی لازم آئے گی کہ آپ کی اس متعینہ تعداد سے اگر ایک بھی کم ہو تو گویا آپ نے ایک ایسے کو نبی مانا جو نبی نہیں تھا۔ اور اگر آپ کی متعینہ تعداد سے ایک بھی زائد ہو تو گویا آپ نے ایک ایسے کو نبی نہیں مانا جو اشرک کا نبی تھا۔ ان دو خرابیوں میں سے کوئی نہ کوئی ایک خرابی لازم آئے گی۔ یا تو "غیر نبی" کو نبی ماننا لازم آئے گا۔ یا کسی نبی کی نبوت سے انکار۔ اور یہ بات بالکل واضح رہے کہ غیر نبی کو نبی ماننا بھی کفر ہے۔ اور کسی نبی کی نبوت کا انکار بھی کفر ہے۔ لہذا اب سمجھ لیں کہ سماعت فرمائیے۔ آج کسی کے علم کا خواہ کتنا ہی چرچا ہو۔ زبرد تقویٰ اور پارسائی کے گن گائے جاتے ہوں۔ اس نے قرآن کا ترجمہ بھی کیا ہو اور پیری مریدی بھی۔

لیکن اگر اس کے مرید و معتقد نے حالت خواب میں اس کو رسول اشرہ کہا ہو۔ اور حالت بیداری میں نبی اور اس پر لے اپنے اس مرید سے توبہ نہ کرائی ہو۔ بلکہ معلوم ہونے کے بعد صرف اتنا جواب دیا ہو "بعونہ تعالیٰ جس کی طرف تم رجوع کر رہے ہو وہ متبع سنت ہے۔" تو یہ دونوں کے دونوں مجرم۔ انہیں قاضی کے روبرو شرعی عدالت کے کھڑے میں لایا جائے گا۔

چونکہ منصب نبوت کسی "نہیں" وہی ہے۔ علم و فضل اور لوگوں کی بھڑ بھڑ کی بنیاد پر یہ منصب حاصل نہیں کیا جاتا۔ بلکہ خدا جسے منتخب فرماتا ہے وہی نبی و رسول ہوتا ہے۔ خدا کے دین کا موسیٰ سے پوچھے احوال کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے۔

لہذا خدا نے قدیرانہ آیت درود "میں علی بنی" فرما کر اشارہ کر دیا کہ جب ان کے مقام نبوت پر درود بھیجا جا رہا ہے۔ تو اشرک ان

کے سہارے زندہ ہو گیا تو ”معجزہ“ ہو گیا۔

یہی ایک مردہ کی نفس پر رونے والے اکٹھے بیٹھتے ہیں
سرکارِ غوث الاعظم یا میرے غریب نواز کا گذر ہوا۔ آپ نے فرمایا اللہ جاب
یسا کیوں ہے؟ یہ کہتے ہی وہ اللہ کھڑا ہوا۔ دیکھو یہاں کام وہی ہے مگر
یہاں یہ کہا جائے گا کہ یہ مَر تو گیا تھا مگر میرے غوث و خواجہ کی کرامت ہے
کہ زندہ ہو گیا۔

دیکھو کام نہیں بدل رہا ہے حقیقت و معنویت میں بھرو پر کیا
ہے لیکن نسبتیں بدلتی جا رہی ہیں الفاظ بدلتے جا رہے ہیں۔ زندہ ہونے کی
نسبت خدا کی طرف کی گئی تو وہاں ”قدرت“ کہا۔ اسی زندہ ہونے کی
نسبت سید عالم کی طرف کی گئی تو وہاں ”معجزہ“ کہا گیا۔ اور اسی زندہ ہونے
کی نسبت غوث و خواجہ کی طرف کی گئی تو اسے کرامت کہا گیا۔

نوٹ: جو گیوں سے جو خرق عادت افعال صادر ہوتے ہیں اسے
”استدراج“ کہا جاتا ہے۔ وہ ایک الگ تھلک شے ہے وہ اس کا بے جوڑ
بیوند بھی نہیں ہو سکتا۔؟

حضرات! یہ وہ مثال ہے کہ الفاظ و شے ایک جیسی ہے۔ مگر
جداگانہ نسبتوں سے الفاظ بدلتے گئے، قدرت، معجزہ، کرامت۔

لیکن ”صلوٰۃ“ ایسی مثال ہے کہ اس کی نسبتوں کے بدل جانے
سے معنی تو بدل جائیں گے لفظ میں تبدیلی نہ آئے گی۔ اب آپ اسے سماعت
فرمائیں:

(۱) صلوٰۃ کی نسبت خدا کی طرف کی جائے کہ اللہ نے اپنے محبوب
پر صلوٰۃ بھیجا تو اس کے معنی ہیں ”نزولِ رحمت“ یعنی اللہ نے اپنے پیارے
مصلیٰ پر رحمتیں نازل فرمائیں۔ اور اگر اسی صلوٰۃ کی نسبت ملائکہ کی جانب

کی جائے کہ فرشتوں نے رسولِ خدا پر "صلوٰۃ" بھیجا تو اس کے معنی ہیں۔
 "استغفار" یعنی طلبِ مغفرت۔ اور اسی صلوٰۃ کی نسبت اگر مومن کی طرف
 کی جائے یعنی مسلمانوں نے صلوٰۃ بھیجا تو اس کے معنی ہیں درود شریف کے
 جیسا کہ ہم اور آپ پڑھتے ہیں: اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ النَّبِیِّ الْاَمِّیْنِ
 وَالْاَبْدَانِ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ۔

دیکھئے یہاں نسبتوں کے بدل جانے سے معنی بدل گئے مگر لفظ وہی
 نکلتا ہے:

حضرات! اگر صلوٰۃ کے معنی آپ نے سمجھ لئے تو ایک بہت
 لطیف نکتہ سماعت فرمائیں:

جب آیت درود، آپ پر نازل ہوئی تو صحابہ کرام نے انتہائی
 ادب سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ اس آیت مبارکہ میں صلوٰۃ اور سلام
 دونوں کا حکم ہے۔ آپ نے ہمیں سلام کا طریقہ تو ارشاد فرمایا لیکن ہم یہ
 نہیں جانتے کہ آپ پر "صلوٰۃ" کیسے بھیجی جائے۔؟ آقائے کائنات نے
 ارشاد فرمایا۔ یوں بھیجا کرو:

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ النَّبِیِّ الْاَمِّیْنِ وَالْاَبْدَانِ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ
 حَضْرَتِ! اب آپ کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ صل کا مفہوم
 کیسا ہے؟ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اے اللہ تو صلوٰۃ بھیج حضرت محمد مصطفیٰ
 صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر۔

ذرا غور فرمائیے! خدا فرماتا ہے اے ایمان والو! تم صلوٰۃ بھیجو
 اور جب آقائے دو عالم سے صحابہ کرام نے دریافت کیا کہ ہم آپ پر
 صلوٰۃ کیسے بھیجیں تو سرکار نے اس طرح فرمایا: اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی
 اَسْرَ تَوْصَلُوۃً یَّهْجُ حَضْرَتِ مُحَمَّدٍ مِصْطَفٰی صَلِّی اللہ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم پر۔

چنانچہ آپ جس قدر بھی درود شریف دیکھیں خواہ وہ چھوٹا ہو یا

بڑا ہو، درود تاج ہو یا درود کھی، نماز کا ہو یا غیر نماز کا۔ سب کی ابتدا
 اللہ صلی علیہ وسلم سے ہے۔ یعنی اے اللہ تو صلوٰۃ بھیج۔

حضرات! قابلِ توجہ ہے یہ مقام۔ پروردگار نے تو نہ جانے
 کتنے احکام نازل فرمائے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ۔ سبھی کا حکم دیا
 گیا مگر سرکار نے اس کا طریقہ یہ نہیں سکھایا کہ تم کہو اے اللہ تو نماز
 پڑھ لے۔ اے اللہ تو ہی روزہ رکھ لے، تو ہی زکوٰۃ دیدے اور تو
 ہی حج کر لے۔ یہ جس قدر بھی احکام ہیں ہم اسے خود انجام دیتے ہیں۔

لیکن درود شریف ہی ایک ایسا فعل ہے کہ اس کا حکم ہم
 کو دیا گیا۔ اور ہم خود خدا ہی سے کہتے ہیں کہ توجناب رسالت مآب
 پر صلوٰۃ بھیج۔ اور من مانی نہیں کہتے بلکہ سید عالم کے سکھانے سے
 کہتے ہیں۔

اربابِ حل و عقد اس کا بہت ہی عقیدت مندانہ اور عشق و
 محبت سے بھرا جواب ارشاد فرماتے ہیں۔ اس میں آقائے دو جہاں
 کا اشارہ یہ ہے کہ تم اپنی عاجزی کا دامن خدا کی بارگاہ میں پھیلا کر عرض
 کرو کہ اے پروردگار! تیرے محبوب کی ذات والا صفات اتنی بلند و
 بالہے کہ ہم ان کی بارگاہ کے صلوٰۃ کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ لہذا اے
 میرے رب تو ہی صلوٰۃ بھیج حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر۔

شمع شبستان رضا کے کندہ شدہ نقوش

۲۰/۰۰	نفع تجارت	۸/۰۰	نقش برائے انگوٹھی فی نقش
۲۵/۰۰	نقش محسن (اپنی بات منوانے کے لیے)	۱۵۰۰۰	۲۲ نقش برائے انگوٹھی مکمل سیٹ
۲۵/۰۰	اکسیر اطفال (بچوں کی ضد دور)	۱۸۰۰۰	۲۲ نقش والی انگوٹھی سادہ
۹۰۰۰	تھمیر جنب محیط الاسرار	۷۵۰۰۰	۵ نقش والی انگوٹھی سادہ
۲۵/۰۰	شفائے امراض	۶۰/۰۰	۵ نقش برائے انگوٹھی روزگار
۲۵/۰۰	اکسیر شکم (پیٹ کی بیماری)	۱۵۰۰۰	چراغ بڑا (دافع آسیب بر قسم)
۱۲۰۰۰	جامع الکسیر	۱۲۰۰۰	چراغ درمیانہ (حصول روزگار)
۲۰۰۰	وصول قرض	۱۲۰۰۰	چراغ چھوٹا (برائے صحت زامانی)
۲۰۰۰	نقش سیفی (جادو کا آثار)	۲۵۰۰۰	نقش زن و شوہر
۲۰۰۰	تھمیر جنب	۲۵۰۰۰	نقش نہ نبوت
۲۰۰۰	چار نقل شریف	۱۲/۰۰	نقش دمر
۲۵/۰۰	تیر و تفنگ (دشمن کے حملے سے بچاؤ)	۱۵۰۰	نقش القلوب تیز می ذہن
۴۰۰۰	استقرار حمل	۲۵۰۰	نقش اعظم (ہر کام کے لیے)
۲۵/۰۰	بری عادت چھوڑنا	۲۵۰۰	نقش حلاوت حمل
۲۵/۰۰	سات سلام	۲۵۰۰	نقش پڑ جانے کے لیے
۲۰۰۰	جامع الکالات (ہر کام کے لیے)	۱۲۰۰۰	نقش نوری نمبر ۱
۲۰۰۰	جیب خالی نہ رہے	۱۰۰/۰۰	نقش نوری نمبر ۲ جامع المطلب
۱۵/۰۰	پتہ آسانی و امن کا لے	۳۰/۰۰	دافع دیو پرپی
۲۵/۰۰	کنوئے کنواری کی شادی کے لیے	۳۰۰۰	جن آبیب
۱۵/۰۰	نقش بسم اللہ	۲۰۰۰	نقش سورہ یسین
۲۰/۰۰	اختلاج قلب	۲۰۰۰	آیت انکریسی
۲۰۰۰	اولاد نرینہ	۱۸/۰۰	حفاظت جان (بچوں کے لیے)
۱۲۰۰	تختہ عرب سنہری	۱۵/۰۰	دافع مرگی
۱۰۰۰۰	تختہ عرب سادہ	۱۵/۰۰	پتہ دودھ پینے لگے
۲۰/۰۰	حفاظت از نظیر (بچوں کے لیے)	۱۸/۰۰	سورہ اخلاص

مکتبہ نوریہ رضویہ - ۱۱ - گنج بخش روڈ لاہور فون ۲۵۵۱
روحانی پبلشرز نورانی جامع مسجد میں بازار شام نگر چورجی لاہور

اعلیٰ حضرت علامہ الشاہ احمد رضا خان بریلوی دیگر علماء اہل سنت مجتہد علیہ و تعویذات کا مستند

تصحیح شدہ مجموعہ

تصحیح شدہ
عبد العزیز مخدوم پشی

شمع شبستان رضا

مرتب
علامہ اقبال احمد نوری

کمال ازیں بہت سے اداروں نے کتاب عذا کو شائع کیا مگر کسی نے بھی اس کی صحت لفظی اعرابی عدوی کی طرف توجہ نہ دی۔ ہوتے ہوتے یہ کتاب مجموعہ اعمال و وظائف نہ رہا بلکہ مجموعہ اغلاط بن گیا جس کی وجہ سے عالمین و قارئین کا اس پر سے اعتماد اٹھنے لگا۔ لیکن بفضلہ تعالیٰ روحانی پبلشر نے تین سال کی محنت شاقہ کے بعد اس کتاب کو اس قابل کر دیا کہ اب اس میں ہر لفظ ہر نقش واضح عربی عبارات اعراب کے ساتھ ہر جملہ غلطی سے پاک اس کی کتاب و تصحیح با وضو کی گئی۔ کتابت کرنے والے بھی عامل، تصحیح کرنے والے حضرات بھی عالم با عمل۔ اب بڑا درمیانہ اور چھوٹا چراغ، جامع المطلوب، درود شفاء مع آیات شفاء جامع الکلمات، تفسیر جنہ محیط الاسرار، تحفہ نوری نمبر ۲، درود شفاء، درود مرگی، نقش مخمس، ۱۳۳ سورتوں کے نقوش، نقوش برائے اعضاء جسمانی، باب النجوم، جملہ حروف کے موکل مکتوبی، ملفوظی، ظاہری باطنی، اسمائے جبروت، اسمائے باری تعالیٰ، طبی نسخہ جات جامع التفسیر استخارہ، فالنامہ، خواب نامہ و دیگر تعویذات ایسے ہیں جیسے آپ چاہتے ہیں۔

نوٹ:- بڑی محنت سے کتاب کو صحیح کیا گیا ہے پھر بھی کہیں آپ کو کوئی غلطی نظر آئے تو فوراً نشاندہی فرمائیں تاکہ اس کی تصحیح کر دی جائے

عمدہ کاغذ، بہترین جلد، رنگین ٹائٹل، ہدیہ ۷۵ روپے

ملنے کا پتہ

مکتبہ نوریہ رضویہ، رکنج بخش روڈ لاہور فون نمبر ۲۱۳۱۹۱